جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

(حکومتِ پاکستان، وزارت ثقافت)

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510

[+92-42] 9203-573

Fax: [+92-42] 631-4496

Email: director@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 969-416-093-6

طبع اول :

تعداد : ۵۰۰

قیمت : /-روپے

مطبع : ، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۷۳۵۷۲۱۴

حسن ترتیب

(ابواب، ذیلی عنوانات)

پیش لفظ

شجرہ نسب اور تحریروں کے عکس

باب اوّل: راجا حسن اختر کا تعارف اور خدمات

☆ خاندانی پیش منظر

☆ آبا وٴ اجداد

☆ پیدائش اور تعلیم و تربیت

☆ کلام اقبال سے وابستگی

☆ موروثی متاع

☆ وفات اور تعزیتی پیغامات

☆ سماجی خدمات

☆ سیاسی خدمات

باب دوم: راجا حسن اختر کی اقبال شناسی اور باہمی روابط

☆ اقبال سے قریبی مراسم

☆ اقبال سے ملاقاتوں کا بیان

☆ اقبال سے عقیدت

☆ اقبال کے آخری ایام

☆ مزار اقبال اور یوم اقبال کا ذکر

☆ اقبال شناسی فکری اور شعوری اثاثہ

باب سوم: راجا حسن اختر کا مقام

☆ شعرا کی نظر میں

☆ جرائد کے پیش نظر

☆ اعزہ و احباب کی نظر میں

باب چہارم: راجا حسن اختر کے مکاتیب

☆ حمید نظامی کی وفات پر لکھا ہوا خط

☆ کرنل ظہور کے نام سفارشی خط

☆ ظہوری اور سعودی کے نام خط

☆ قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے عوام کے نام خط

☆ میجر ظہور اختر کے نام خط

☆ ایک انگریزی خط کا ترجمہ

☆ ہوائی جہاز سے لکھا گیا ایک خط

باب پنجم: راجا حسن اختر کی تنقید اقبالیات

☆ شاعرِ ربانی

☆ مسلک وفا

☆ مردِ حق

☆ بارگاہ قلندر

☆ دولت خداداد

☆ اقبال اور جناح

☆ یوم خاموشی

کتابیات

باب اوّل

راجہ حسن اختر کا تعارف اور خدمات

- خاندانی پس منظر
- آبا و اجداد
- پیدائش اور تعلیم و تربیت
- کلام اقبالؒ سے وابستگی
- موروثی متاع
- وفات اور تعزیتی پیغامات
- سماجی خدمات
- سیاسی خدمات

راجا حسن اختر کا تعارف اور خدمات

۱۔ خاندانی پس منظر

راجا حسن اختر کا شمار اردو ادب کے ان گنے چنے جوانوں میں ہوتا ہے۔ جو حضرت علامہ اقبالؒ سے والہانہ عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔

اُن کی طبیعت میں اسلامیت اور آزادی کا خاص جوش تھا، جو حضرت علامہ اقبالؒ سے خاص وابستگی کا باعث بنا۔ اگر ہم ان کے خاندانی پسِ منظر پر غور کریں تو اوالعزمی کی داستانیں بکھری نظر آتی ہیں۔

راجا حسن اختر کا تعلق ایک جری، بہادر اور سر گکھڑ قبیلے سے تھا جس نے تاریخ پر آشوب ادوار میں سلاطین وقت سے پنجہ آزمائی کی۔ حضرت علامہ سے قربت اور توجہ کے باعث راجا حسن اختر کی شخصیت ایک ذی حس اور دردمند مسلمان کی صورت میں ڈھل گئی۔[۱]

گکھڑ خاندان کے متعلق ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کی کتاب:

"Extract From the District & States Gazetteers of the Punjab (Pakistan)"

میں رقم ہے۔ ترجمہ

’’اس درے کے جنوبی کناروں پر گکھڑوں کا مشہور قلعہ پھروالہ واقع ہے۔ جس کو بابر نے حاصل کیا اور ابھی تک ادمال گکھڑوں کے مشہور اور زوال یافتہ خاندان کی قیام گاہ ہے۔ سواں کے آر پار راولپنڈی کے میدان میں پہاڑی جنوب مغرب کی طرف کرپا اور بھمباتر اڑ کیوریان اور ناگوار پہاڑیوں کی طرف بڑھتی ہے جو آخر کار کھیری مورت رینج سے چند میل پہلے میدانوں میں غائب ہو

جاتی ہے۔[۲]

آگے چل کر قلعہ پھروالہ کے متعلق مزید لکھا گیا ہے پھر یہ پہاڑی نرڑ کی پہاڑی سے الگ نکلتی ہے یہاں اس کی اونچائی سطح سمندر سے پچیس سوفٹ اور دریا سے آٹھ سوفٹ ہے اور یہ ایک پتھریلی ویران ایک میل لمبی پہاڑی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے جس کے مشرقی کنارے پر ابھی تک گکھڑوں کا خوب صورت قلعہ دکھائی دیتا ہے۔ دریائے سواں کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

''پھروالہ سے اوپر جہاں اس کا راستہ پہاڑی ہے۔ یہ ایک پہاڑی نالہ کی حیثیت رکھتا ہے''۔[۳]

پھر یہ الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں:

جہاں سے قدیم روایات، ایک مورخ کو معتبر ریکارڈ مہیا کرتی ہیں وہ ضلع کی تاریخ گکھڑ قبیلے کی تاریخ ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کے ابتدائی حملوں کے زمانے میں ممتاز حیثیت حاصل کی اور اپنی حکم رانی روالپنڈی ہزارہ کے کچھ حصوں اور ضلع جہلم پر دہلی اور آگرہ کی بادشاہت سے الگ خودمختار حیثیت میں قائم رکھی ...... ان کی اپنی بیاہ کردہ سرگزشت کے مطابق گکھڑ پہلے ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سلطان کید کی اولاد ہیں جو اصفہان میں کیان کے باشندے گوہر یا کیگوہر کا بیٹا تھا۔[۴]

رائے زادہ دُنی جو گکھڑوں کے عہد میں بہ مقام گلیانہ قانون گوئی کے عہدے پر مامور تھا، نے گکھڑوں کی جو تاریخ فارسی زبان میں لکھی ہے اس کا ترجمہ راجا محمد یعقوب طارق نے کیا۔ اس ترجمے کے مطابق گکھڑ قوم کی:

یہ تاریخی حقیقت شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ گکھڑ قوم نے برصغیر ہند کے شمال مغربی حصہ کے ایک وسیع علاقے پر جو دریائے سندھ سے چناب تک پھیلا ہوا تھا، تقریباً ساڑھے سات سو سال (۱۰۲۱ء سے ۱۷۷۳ء) تک بلاشرکت غیرے

حکومت کی۔ایک قبیلے کا تاب ناک ماضی اس کے مستقبل کی صحیح اور صحت مند نشوونما کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے''۔[۵]

رائے زادہ دُنی چند خاندانِ گکھڑاں از ابتدائے خلافت سلطان کیگو ہر کے تحت لکھتا ہے:

روایت ہے کہ سلطان کیگو ہر، کیکاؤس اور قیصر کا ہم عصر تھا ور علاقہ اصفہان کا فرماں روا تھا..... سلطان کیکاؤس کی تخت نشینی پر کیگو ہر کو کیان کی سرداری بھی تفویض ہوئی تا کہ جمیع سردارانِ زیرکمان لائے...... جس طرح کہ بہت سے باز ایک آشیان میں اور بہت سے شیر ایک جنگل میں نہیں رہ سکتے، سلطان کید نے جو سلطان کیگو ہر کا لڑکا تھا، بہت بڑے سازوسامان کے ساتھ تبت کے ملک پر چڑھائی کی۔ جنگ وجدل اور قتل و غارت کے بعد تبت کو تصرف میں لایا گیا...... اسی طرح سلطان کید سے لے کر سلطان قاب تک (گیارہ پشتیں) گکھڑوں نے تبت کے ملک پر حکم رانی کی۔[۶]

گکھڑوں کی حکومت کی حدود کے متعلق یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ دریائے اٹک سے دریائے جہلم تک حکم ران رہے اور سلطان مقرب نے سلطنت کی حدود کو گکھڑ منڈی تک پھیلا دیا۔ملاحظہ کیجئے عزیز ملک کی تحقیق:

''احمد شاہ ابدالی نے سلطان مقرب خان کو ''نواب'' کے خطاب سے نوازا اور کہا'' درمیانِ اٹک و جہلم شد مقرب بادشاہ'' اس گکھڑ سلطان نے اپنی سرحدوں کو اٹک سے گکھڑ منڈی تک پھیلایا''۔[۷]

رائے زادہ چند دنی نے گکھڑ حکم رانوں کی فہرست اپنی تصنیف ''کیگو ہر نامہ'' میں بہ عنوان تفصیل عمل داری گکھڑاں در ملک پوٹھوار و دیگر ممالک از ''۴۱۲ھ لغایت ۱۱۸۶ھ'' کے تحت درج ذیل دی ہے:

''گکھڑ شاہ، بج شاہ، مہپال، راجر، سید، منک، لہر لکھن، ملک قد، ملک گرلا،

ملک سکندر، ملک فیروز، ملک بوکا، ملک سیر، ملک پیلو، سلطان ہاتھی، سلطان سارنگ، سلطان آدم، سلطان کمال، سلطان ممارا خان، سلطان جیپال (جلال خان)، سلطان اکبر قلی خان، سلطان مراد قلی خان، سلطان لشکری خان، سلطان دلاور خان، سلطان معظم خان، سلطان مقرم خان، نادر علی خان، سعد اللہ خان''۔[۸]

۲۔ اباؤاجداد

شجرہ نسب جو کیگو ہر نامہ میں موجود ہے اس کے مطابق مقرم خان کے بیٹے نادر علی خان کے بعد اسد اللہ خان پوٹھوہار حکمران ہوا جو نادر علی کا بھائی تھا۔ اس کا ایک اور ثبوت کیگو ہر نامہ کی اس تحریر سے ملتا ہے:

''مقرر گشتن نواب سر بلند خان برائے مالش سکھاں دکارِ سکھاں فروغ یافتن'' جب احمد شاہ ابدالی کو نواب مکرم خان کی شہادت اور سکھوں کی کام یابی کی خبر پہنچی تو اس نے نواب سر بلند خان کو پنجاب پر مقرر کیا۔ وہ پوٹھوہار وارد ہوا۔ اس علاقہ کو مطیع فرمان کیا اور سکھوں کی چیرہ دستیوں کی اطلاع پا کر رہتاس پہنچا، نیز قلعہ رہتاس کو خوراک وسپاہ سے معمور کرکے لڑائی کے لیے تیار ہو گیا۔ نادر علی خان اور اسد اللہ کان بھی نواب مذکور کے ساتھ قلعہ ہی میں تھے۔ سردار گجر سنگھ نے سلطان نادر علی خان اور اسد اللہ خان کو اپنا مطیع کر کے پھروالہ کی طرف روانہ کر دیا...... اس کے بعد گجر سنگھ نے تپہ حویلی یعنی پھرالہ مع چند دیہات سلطان نادر علی خان اور اسد اللہ خان کو واگزار کیا۔[۹]

نادر علی خان اور اسد اللہ خان بھائی تھے بعض مقامات پر اسد اللہ خان کا نام سعد اللہ خان لکھا ہے اور ہے اور کیگو ہر نامہ میں اسد اللہ کے والد کا نام مکرم خان ہے جو در حقیقت مقرب خان ہے۔ راجا حسن اختر کا شجرہ نسب سلطان مقرب خان تک اس طرح ہے۔ راجا حسن اختر ولد کرم داد کان ولد حیات خان ولد شادمان خالد ولد سلطان مقرب خان۔ محمود اختر کیانی کی کتاب میرا شہید بھائی میں بھی سلطان

مقرب خان درج ہے۔ سلطان ظہور اختر لکھتے ہیں:

کرم داد خان وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں شملہ جایا کرتے تھے۔ راستے میں پانی پت پڑتا تھا۔ ازراہ عقیدت پانی پت اتر کر اس جنگی میدان میں گئے جہاں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ان کے جدِ بزرگ سلطان مقرب خان والئ پوٹھوہار نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ شہر میں گئے تو ''اولی راولی می شناسد'' مولانا حالی پانی پتی سے بھی ملے ...... حالی نے مقرب خان کے پڑپوتے کو اتنا پیار کیا کہ دونوں خلوص ومحبت کے رشتوں سے منسلک ہو گئے۔[۱۰]

راجا حسن اختر کے والد کے پردادا سلطان مقرب خان آخری خودمختار گکھڑ حکم ران تھے۔ District and Gazetteers میں درج ہے:

شادمان خان ایک ضعیف الذہن شخص تھا اور بادشاہ نے پھروالہ جلال خان کو بخش دیا۔ یہ سردار ایک عظیم جنگ جو تھا اور شاہی جرنیل کی حیثیت سے کوہاٹ، بنوں اور یوسف زئی میں لڑا ...... اس کے بیٹے اور پوتے نے کام یابی سے حکم رانی کی ...... اللہ داد خان شادمان خان کی طرح کمزور عقل کا مالک تھا لیکن اس کی بیوی رانی منگا بہت مشہور تھی جس نے حکومت کے معاملات کو جذبے اور کام یابی سے چلایا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے بیٹے اکبر شاہ ثانی جو کہ دہلی کا حکم ران گزرا ہی کی شادی منگا کی ایک بیٹی سے کی۔ اس طرح آخری مغل حکم ران سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی والدہ ادمال گکھڑ تھیں۔ رانی منگا کا بیٹا دولو خان بڑا ہوا تو اس نی سرداری سنبھال لی۔ وہ اپنی فیاضی میں مشہور تھا اور اس لیے وہ لوگوں میں لاکھی دولو خان کے نام سے مشہور تھا۔ پھر معظم خان حکم ران ہوا جس نے تیرہ سال حکومت کی اور سلطان مقرب خان آخری خودمختار گکھڑ سردار تھا۔[۱۱]

اس تحریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ راجا حسن اختر کے والد کرم داد خان کے پردادا سلطان مقرب خان تھے مکرم خان نہیں تھے۔ علاقہ پوٹھوہار کے یہی آخری خودمختار حکم

ران تھے۔

اور کیگوہرنامہ میں بھی ناموں Distrect & States Gazetters کا فرق ہے۔ کیگوہرنامہ میں سلطان مقرب خان کے بیٹوں کے نام منصور علی خان، نادر علی خان، اسد اللہ خان، ابراہیم خان اور شادمان خان درج ہیں۔ لیکن Distect & states Gazetters میں سعد اللہ خان اور نذر علی درج ہیں۔ سعد اللہ خان اونذر علی خان بغیر نرینہ اولاد کے وفات پا گئے۔ منصور خان اور شادماں خان ان کے علاقوں کے وارث ہوئے۔[۲۱]

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلزار اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

سلطان کیگوہر المعروف گکھڑ شاہ نے سلطان محمود کی افواج میں سرلشکر کی حیثیت سے ہندوؤں کی اس مجموعی فوج کو جو ہندریاستوں نے سلطان غازی کے مقابلے کے لیے تیار کی تھی۔ ہتھیال حضرو کے مقام پر اپنی قلیل تعداد کے باوجود شکست فاش دی...... دوسری مثال جس کا تذکرہ علامہ اقبالؒ عموماً کیا کرتے تھے، سلطان مقرب کان کی اسلام کی خاطر مرہٹوں سے نبرد آزمائی تھی جنھوں نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کی معیت میں مرہٹوں کو شکست فاش دی...... سلطان مقرب خان اور ان کے ساتھیوں کا یہ کارنامہ اسلامی تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ نقش رہے گا۔ اس کے بعد سلطان مقرب خان نے ۱۷۶۵ء میں سکھو کے خلاف الم جہاد بلند کیا اور گجرات کی دیواریوں کے باہر سردار گجر سنگھ بھنگی کے خلاف لڑا اور شکست کھا کر جہلم کی طرف آیا۔ ڈومیلی کے سردار ہمت خان نے اسے گرفتار کرلیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار کر خود سردار بن گیا۔

غلام اکبر ملک اپنی تحقیق کی روشنی میں لکھتے ہیں:

اکبر اعظم نے گکھڑوں...... کی جاگیر کو چار برابر حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آدم خان کے پوتے جلال خان کو موضع دان گلی اور اس کے نواحی ۴۵۶ مواضع دے دیے۔

جب کہ کمال خان کے بیٹے مبارک خان کو پھروالہ کے ۳۳۳ مواضع دے دیے گئے۔اس طرح اکبرآباد اور اس کے ۲۴۲ ملحقہ آدم کے چھوٹے بیٹے شیخ کجا کو ملے جب کہ روال پنڈی کا سارنگ خان کے تیسرے بیٹے سعید خان کو دیدیا گیا۔اسی دوران سارنگ خان کا ایک پوتا فتح خان علاقائی حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ضلع ہزارہ کی طرف چلا گیا جہاں اس نی موضع خان پور آباد کیا۔یہی فتح خان راجا فیروز خان اور جہاں داد کان کا جدِ امجد تھا۔جب گھکڑوں کی جاگیر چار حصوں میں تقسیم ہوگئی تو اس کیا یک سال بعد ہی کمال خان کا بیٹا مبارک خان وفات پا گیا اور اس کی جگہ اس کے حصہ کی جاگیر شادماں خان کے حصہ میں آئی جو مبارک خان کا بڑا بیٹا تھا۔[۱۳]

کیگوہرنامہ میں شادمان خان کے والد کا نام مکرم خان ہے۔جو درحقیقت مقرب خان اور مبارک خان تو بالکل غلط ہے۔یہ شجرہ نسب اس طرح ہے:

راجا حسن اختر ولد راجا کرم داد خان ولد حیات اللہ خان ولد شادمان خان ولد مقرب خان۔اس کے علاوہ غلام اکبر ملک نے بعض نام لکھنے میں بھی غلطی کی ہے ڈنگی دراصل دان گلی ہے۔دورِ ہمایوں میں اسے کالا کوٹ بھی کہا جاتا تھا۔اسی کالا کوٹ قلعہ پر شیر شاہ سوری نے کئی حملے کیے اور انھوں نے ایک مقام کو پرپھروالہ لکھا ہے جو گکھڑوں کی مشہور قیام گاہ رہی ہے۔اور روال پنڈی سے کہوٹہ جاتے ہوئے سہالہ سے کچھ آگے بائیں جانب ایک بورڈ نصب ہے جس پر پھروالہ کے راستے کی نشان دہی کی گئی ہے۔اور یہ لفظ ''پھروالہ'' صاف دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ دان گلی بھی اس علاقے (پوٹھوہار) کا مشہور مقام ہے اور لوگ دنا گلی کہہ کر پکارتے ہیں۔

راجا حسن اختر کے والد راجا کرم داد خان کے بارے میں یہ تحریر نظر سے گزری:

راجا کرم داد خان گکھڑ خاندان کا ایک نام ور سردار گزرا ہے۔یہ اس وقت پھروالہ

کے قدیم قلعہ میں رہائش پذیر تھا۔ انگریز حکومت کی طرف سیادمال رئیسوں کو کچھ مراعات بھی حاصل رہی ہیں۔ گکھڑوں کے ادمال خاندان کی پھروالہ شاخ بہ ہر کیف باقی سب شاخوں سے زیادہ معروف رہی ہے۔ نمایاندہ شاخ کے رئیس فضل دادخان، علی بہادر کان اور رحیم علی خان بھی انگریز دور میں مراعات یافتہ رہے ہیں ۔ان کے پاس زیلداری بھی تھی ۔ سعید پور ضلع روال پنڈی کے سرنگال گکھڑ بھی ادمالوں کی مشہور شاخ رہی ہے......سلطان سارنک خان اپنے دور کا نامی گرامی انسان تھا۔[۱۴]

۳۔ پیدائش اور تعلیم وتربیت

سلطان ظہور اختر فرزند ارجمند راجا حسن اختر اپنے والد کی پیدائش کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

پچیس دسمبر کی صبح اذان کے وقت سلطان مقرب خان آخری تاج دار پوٹھوہار کے گھرانے میں دادخان کے گھر کہوٹہ میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ گھرانہ عجیب کسم پرسی کے حالات سے دوچار تھا۔ مفلسی میں مبتلا رئیس گھرانہ جو جنگِ گجرات سے بعد سکھوں کے مظالم سہنے کے بعد ڈوگروں کے مصائب اور قید و بند سے باؤنڈری کمشنر مسٹر ایبٹ کی وساطت سے ۱۸۴۸ء میں آزاد ہوا۔ کرم دادخان اس وقت سے تھے غالباً اس وقت سات آٹھ سال عمر تھی۔[۱۵]

راجا حسن اختر کا پیدائشی نام کرم علی خان تھا لیکن سکول و کالج میں ان کا حسن اختر گکھڑ اور راجا حسن اختر درج ہے۔ نوکری کے درمیان سول لسٹ میں حسن اختر مرزا درج ہے۔ تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۹۰۴ء ہے۔ ملازمت سے پہلے بی۔ اےتک تعلیم حاصل کی اور ملازمت کے بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کردی۔ لڑکپن سے ہی فٹ بال کھیلنے، گھڑسواری، نیزہ بازی، بندوق اور باز کے شکار، شعروشاعری اور مضمون نویسی کا شوق تھا۔

پچیس دسمبر ۱۹۰۴ء کی صبح اذان کے وقت سلطان مقرب خان آخری تاج دار پوٹھوہار کے گھرانے میں کرم داد خان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔[16]

راجا حسن اپنی والدہ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کرم داد خان کی بڑی بیوی جو انتقال کر گئی تھیں ان کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلطان علی تھا۔ یہ سلطان علی بھائی کی پیدائش کے وقت نوجوان تھے۔

نومولود کا نام کرم علی تجویز ہوا۔ کرم داد خان وائسرائے کی کونسل کے اجلاس میں شمل جایا کرتے تھے۔ راستے میں پانی پت پڑتا تھا وہاں مولانا الطاف حسین حالی سے ملے جن کی مسدس اسلامیانِ ہند میں قرآن اور دعاؤں کے بعد پڑھی جاتی تھی۔ کرم داد خان نے انھیں بتایا کہ اللہ نے انھیں ایک لڑکا عطا کیا ہے۔ حالی بہت خوش ہوئے اور وضو کر کے قرآن حکیم سے فال نکالنے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد فرمایا: ''سلطان صاحب ح اور الف نکلتا ہے''۔ میں نے اپنے ایک برخوردار کا نام حسن اختر رکھا ہے آپ اس بچے کا نام حسن اختر رکھیں۔ کرم داد خان نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دو تین دن کے بعد پانی پت سے لوٹے اور یہ غیر پوٹھوہاری نام کرم علی صاحب کا رکھ دیا گیا۔[17]

راجا صاحب گارڈن کالج کے طالب علم رہے۔ ان کو ابتدائی قرآنی تعلیم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے دی جو ایک جید عالم متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ حضرت مولانا تحریک ریشمی رومال اور تحریکِ خلافت کی وجہ سے معروف ہیں۔ حسن اختر انھیں ماموں جان کہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا نے انھیں چوتھی جماعت تک پڑھایا۔ اس کے علاوہ قرآنی تعلیم حضرت مولانا رومی، سعدی شیرازی، مولانا جامی اور دیگر بزرگوں کے کلام سے اس بچے کو آشنا کیا۔ چوں کہ پھروالہ، دوبھیرن یا کہوٹہ میں پرائمری سے اوپر تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا اور راولپنڈی میں بھی مسلمانوں کی کوئی ثانوی تعلیم کی درس گاہ نہ تھی اس لیے چوتھی کے بعد حسن اختر کو مشن

سکول روال پنڈی میں داخل کروا دیا گیا۔ جس کے ساتھ ہوسٹل بھی نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہوٹہ سے روال پنڈی پیدال، گھوڑوں یا گدھوں پر سفر کیا جاتا تھا۔[۱۸]

مشن سکول سے آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کر کے حسن اختر نے گورنمنٹ سکول بھیرہ سے میٹرک پاس کیا۔ اور گارڈن کالج روال پنڈی میں فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا اور یہیں سے بی۔اے پاس کیا۔

بی۔اے پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں۔ پی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کیا۔ وہ مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔

سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے کچھ اور نہیں کر سکتے تھے تو قلمی نام اختیار کر لیا۔ ۱۹۳۵ تا ۱۹۴۷ ''حسن آفاقی''، ''جہاں بیں''، ''بوریا نشیں'' اور ''مرد کوہستانی'' کے قلمی ناموں سے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھتے رہے۔ سرکاری ملازمت ترک کر کے ۱۹۵۰ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ پھر لاہور ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔

۴۔ کلام اقبال

راجا حسن اختر گارڈن کالج کے طالب علم تھے۔ ایک ہم جماعت نے انھیں حضرت علامہ اقبالؒ کے کی نظمیں ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ'' جو ایک کتابچے کی شکل میں چھپی تھیں، پڑھنے کو دیں۔ راجا صاحب کہوٹہ لے آئے اور اپنے والد بزرگ وار راجا کرم داد خان کو دکھایا۔ وہ بھی پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ شیخ محمد اقبالؒ کا نام ان کی نظموں اور اسرار خودی کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ والد بزرگ وار نے کم دیا اقبال سے اس طرح تعلق پیدا کرو جیسے تمھارے بزرگ اہل علم و عرفان سے متعلق رہے ہیں۔

پھر راجا حسن اختر کی خوش بختی نکلی۔ انھیں تیرہ چودہ سال حضرت علامہ کی

خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا۔ گویا کہ:

پہلے کلام اقبالؒ نے انھیں متاثر کیا اور پھر حضرت علامہ کی محفلیں نصیب ہوئیں اور فیض ہم نشینی نے ان کی تقدیر بدل دی۔ انھوں نے کلام اقبال کا ورد اپنی عبادت میں شامل کرلیا۔ کلامِ اقبال کو اپنے اوپر لاگو کرلیا۔ ان کی طبیعت میں عاجزی آتی گئی اور وہ ایک بڑا افسر بن کر بھی درویش، ملنسار اور مخلص تھے۔ خاندانی احساس برتری نے ہمیشہ کے لیے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بلا تخصیص رنگ و نسل سب کے خادم بن گئے۔ اقبالؒ نے انھیں پیغامِ خودی دیا تو انھوں نے خودی کی اہمیت کو مکمل طور پر سمجھ لیا وہ خوددار، حوصلہ مند اور بادِ مخالف کی پروانہ کرنے والے مضبوط مرد مومن بن گئے۔ حضرتِ اقبالؒ کو وہ اپنا پیر و مرشد سمجھنے لگے اور یہ رشتہ ان کی وفات تک قائم رہا۔[۱۹]

قومی درد بھی اقبالؒ کا پیغام تھا۔ قومی درد نہ صرف ان کے دل میں پیدا ہوا بلکہ وہ تحریکِ پاکستان کے مخلص کارکن بن گئے۔ انھیں قائداعظم اور مسلم لیگ سے ہمیشہ پیار رہا۔ وہ پاکستان اور مسلمان کے خلاف کچھ نہیں سن سکتے تھے۔ اقبالؒ کا یہ شعر ان کے لیے بہت موزوں ہے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

۵۔ موروثی متاع

راجا حسن اختر کے والد راجہ کرم داد خان چیف آف گکھڑ ایک باوقار، شریف النفس انسان تھے۔ وہ عجز و انکسار کا مجسمہ تھے ایک خط انھوں نے اپنے بیٹے راجا حسن اختر کو ۲۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا یہ خط ان کے پوتے کرنل سلطان ظہور اختر کے پاس موجود ہے تحریر ملاحظہ کریں:

عزیز از جان طول عمرہ!

بعد از پیار و دعوات آپ کا محبت نامہ موصول ہوا۔آپ نے اس عاجز کے لیے بڑے بڑے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ خدا آپ کو دین و دنیا کی تمام خوشیاں نصیب فرمائے۔بیٹا میں تو آپ سے یہی گزارش کر سکتا ہوں کہ آپ کے جد امجد کی بادشاہت و عمل داری ختم ہو چکی ہے۔ یہ بادشاہت تو آقائے نامدار ﷺ کی اور مولائے کل کی ابدی و حقیقی ہے۔بنی نوع انسان سے محبت، خلق و شفقت فرمائیں۔ دین کی خدمت کریں۔اس شفقت، محبت و خدمت کی بدولت مخدوم کہلائیں گے اور لوگوں کے دلوں میں آپ کی حکومت ہوگی اور یہ وہ حکمت ہے جسے کوئی ختم نہیں کر سکتا نہ ہی کوئی چھین سکتا ہے اور بعد از مرگ بھی حیاتِ جاوداں نصیب ہوتی ہے۔

بیٹا! میں تو آفتاب بر سر کوہ ہوں چند روز میں غروب ہو جاؤں گا۔باپ بیٹے کے لیے جائداد اور مال دولت چھوڑ کر جاتے ہیں لیکن میں عاجز مسکین فقیر ہوں۔ انکسار و عاجزی میری متاع ہے اور یہی چھوڑ کر جاؤں گا۔ایک عاجز اپنے اکلوتے بیٹے کو اور کیا دے سکتا ہے سوائے برگِ سبز کے، اور وہی حاضر کر سکتا ہوں۔آپ کی امی پیار کہتی ہیں۔بھیا کا کوئی خط نہیں آیا۔ظہور، محمود، الدہ اور رعابدہ کو پیار۔

والسلام و دعوات

آپ کا عاجز و مسکین

کرم داد از کھوٹہ

اس خط سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انکساری و عاجزی ان کی موروثی متاع ہے۔اسی موروثی متاع کو راجا حسن اختر نے اپنی زندگی میں شامل کر لیا۔لوگوں سے خلوص اور محبت کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔

جہاں تک کے گولڑہ کے سجادہ نشین حضرت بابو جی آپ سے ملنے آجاتے۔راجا صاحب ان سے کہتے: ”پیر صاحب! میں حاضر ہو جاتا“۔وہ فرماتے: ”آپ کو

وقت کہاں ملتا ہے''۔اس موروثی متاع نے آپ کا وقت قیمتی بنا دیا۔

بہ قول پروفیسر عبدالقادر:

''راجا صاحب کا تعلق عالم استغراق سے تھا۔ وطن سے محبت کا استغراق، انسانیت سے محبت کا استغراق اور کلام اقبال اور حضرت علامہ اقبالؒ سے عقیدت کا استغراق ان کا سرمایہ حیات تھا۔

۶۔وفات اور تعزیتی پیغامات

تحریک پاکستان کے خالق اور مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کے مداح اکتوبر ۱۹۶۴ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ مرحوم و مغفور کی ہر سانس میں اقبالؒ اور پاکستان کا رچا ہوا تھا۔

راجا حسن اختر کی وفات پر جس جرائد میں افسوس کا اظہار کیا گیا ہے اس کو یہاں شامل کیا جاتا ہے۔

نوائے وقت لاہور ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۴ء

راجا حسن اختر کی وفات پر اظہار افسوس

سانگلہ ہل (نمائندہ خصوصی) سانگلہ ہل کے تمام سیاسی وسماجی اور مذہبی حلقوں کی طرف سے راجا حسن اختر کی بے وقت موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا ہے۔کونسل مسلم لیگ کے مقامی صدر چوہدری طالب حسین اور دیرینہ سیاسی وسماجی کارکن مسٹر بشیر احمد نظامی نے تعزیت کے پیغامات بھیجے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ راجا صاحب ایک مخلص ترین، قوم کے خادم تھے اور انھوں نے پاکستان کی بڑی مخلصانہ خدمات سرانجام دیں۔آپ علامہ اقبالؒ کے شیدائی تھے اور شاعر مشرق کی

تعلیمات عام کرنے میں بھی آپ کی جدوجہد اور خدمات قابل ستائش ہیں۔علاوہ ازیں مقامی کنونشن مسلم لیگ کے کارکن اور چیئرمین مارکیٹ کمیٹی خان علی احمد خان اور ان کے رفقاء نے راجا حسن اختر کی وفات پر صدر ایوب اور گورنر مغربی پاکستان کو تعزیتی تار ارسال کیے ہیں۔

ادار یہ نوائے وقت لاہور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء

راجا حسن اختر

قومی اسمبلی کے رکن اور مغربی پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) کے صدر راجا حسن اختر روالپنڈی میں انتقال کر گئے۔اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون! راجا حسن اختر کا شمار محترم بزرگوں میں ہوتا تھا۔انھیں مفکر پاکستان علامہ اقبالؒ کے معدودے چند نیازمندانِ خاص میں منفرد مقام حاصل تھا۔سرکاری ملازمت سے وابستہ ہونے کے باوجود پاکستان دشمن یونینسٹوں کے دورِ حکومت میں انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔مرحوم ابتدائی دور میں نوائے وقت کے بھی بڑے محسن تھے اور اس ادارہ سے ان کا تعلق خاطر آخر دم تک رہا۔قیام پاکستان کے بعد سابق پنجاب میں جو افسوس ناک سیاسی دھڑے بندی ہوئی اور انتقام کو جو چکر چلا مرحوم کو اس سلسلہ میں بڑی مشکل سے دوچار ہونا پڑا اور ڈپٹی کمشنر کے عہدہ سے الگ ہو کر انھیں لاء کالج میں داخلہ لینا پڑا تا کہ وہ گزر اوقات کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کر سکیں۔سابق پنجاب میں اپوزیشن کی تنظیم میں انھوں نے بڑی پامردی سے حصہ لیا۔اس دوران میں وہ مجلسِ مرکزیہ اقبال کے سربرآوردہ رکن کی حیثیت سے

بھی کام کرتے رہے۔ اقبالیات سے ان کی دلچسپی بل کہ شغف کو منفرد حیثیت حاصل تھی۔ ۶۲ء میں بحالی جمہوریت کے بعد وہ برسرِ اقتدار پارٹی سے وابستہ ہو گئے اور اپنے عام احترام کے باعث تنظیم نو کے بعد اس جماعت کی مغربی پاکستان میں شاخ کے صدر بنائے گئے۔ ان کے بعض قریبی احباب بھی ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے لیکن ہر شخص یہ تسلیم کرتا تھا کہ وہ اپنے سیاسی خیالات کے کسی مفاد کے لیے نہیں بل کہ دل سے قائل تھے۔ یہ کیفیت اب بھی سیاست دانوں میں نہ ہونے کے سربراہ رہ گئی تھی۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

نوائے وقت لاہور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء

راجہ حسن اختر کی وفات پر تعزیتی پیغامات

قومی اسمبلی کے سپیکر فضل القادر چودھری نے راجا حسن اختر کی وفات پر اظہار غم کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم ملک کے نامور سپوت تھے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں اور حب الوطنی سے ان کے ہم وطن بہت متاثر تھے۔ ان کی وفات سے قومی اسمبلی ایک ممتاز رکن سے محروم ہو گئی ہے۔

مرکزی وزیرِ تجارت مسٹر وحید الزمان نے راجا حسن اختر کی وفات کو ایک بہت بڑا نقصان قرار دیا اور کہا کہ مرحوم بڑے سلجھے ہوئے متین اور راست باز سیاست دان تھے۔

مرکزی وزیرِ صحت الحاج عبداللہ ظہیر الدین لال میاں نے کہا کہ مجھے راجا حسن اختر کی اچانک وفات سے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میں ایک بہترین دوست اور باوقار

رفیق سے محروم ہو گیا ہوں۔

علامہ اقبالؒ مرحوم کے ممتاز مداح اور راجا حسن اختر کے دیرینہ ساتھی خواجہ عبدالرحیم نے کہا ہے کہ ان کی وفات سے ہم ایک سچے مسلمان اور محبِ وطن پاکستانی سے محروم ہو گئے ہیں۔

مرکزی وزیر قانون و پارلیمانی امور شیخ خورشید احمد نے کہا ہے کہ راجا حسن اختر کی وفات بہت بڑا قومی حادثہ ہے۔ انھوں نے تحریک پاکستان کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور وہ علامہ اقبالؒ کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔

مغربی پاکستان اسمبلی کے سپیکر چودھری محمد انور بھنڈر نے کہا ہے کہ مرحوم بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور انھوں نے اپنی زندگی ملک کی خدمات کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ وہ نہ صرف ایک مخلص کارکن تھے بل کہ ایک بے باک رہنما بھی تھے۔

مغربی پاکستان کے وزیر محنت و معاشرتی بہبود سید احمد نواز گردیزی نے کہا ہے کہ راجا صاحب ایسے وقت پر ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ہیں جب کہ ہمیں ان کی بہت ضرورت تھی، ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو مدتوں تک پُر نہ کیا جا سکے گا۔

ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر مسٹر قیصر مصطفیٰ کی زیر صدارت ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس میں راجا حسن اختر کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔

سید طاہر علی رضوی جنرل سیکرٹری حمایت ال بیت پاکستان نے راجا حسن اختر کی وفات پر گہرے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رحلت پاکستان کے موجودہ دور کا المیہ ہے۔

مرکزی جمعیت القریش اسدیہ مغربی پاکستان کے صدر مسٹر ایم اے غنی کنجاہی نے راجا حسن اختر کی اچانک وفات پر گہرے دلی رنج و غم کا اظہار کیا۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء کے ''چٹان'' میں راجا حسن اختر کی موت پر ایک آرٹیکل لکھا گیا!

آہ! راجا حسن اختر!

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ

مصرع بالا کے تحت جب ہم نے راجا صاحب کی تصویر کو ۲۱ ستمبر کے شمارہ میں سرورق کی زیب و زینت بنایا تھا تو کسے خبر تھی کی اس کے ٹھیک ۲۳ دن بعد یعنی چوبیسویں روز راجا صاحب اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ گویا مرگ ان کے انتظار میں تھی۔ دیکھتی آنکھوں واصل بحق ہو گئے۔ صحت بھی اچھی تھی قلب بھی مضبوط تھا، دماغ بھی شگفتہ تھا اور ایک ترت پھرت تصویر تھے۔ اچانک قلب کے اختلاج کا دورہ پڑا، بس ایک ہی جنبش سے راہ گیر عالم بقا ہو گئے۔ مدرسہ اقبال کے ایک نام ور فرزند تھے۔ کل بھی اقبال ہی کا ایک مصرع قامتِ تصویر کا روپ تھا۔ آج وہ ہم میں نہیں رہے تو اقبالؒ ہی کا ایک اور مصرع عنوان ماتم ہے۔

عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

اقبالؒ ان کے رگ و ریشہ میں رواں دواں تھا۔ وہ اقبال س والہانہ عقیدت اور غیر متزلزل ارادت رکھتے تھے۔ یہی رشتہ تھا جو ہمارے درمیان مشترک رہا۔ پاکستان کے روزِ قیام سے وہ مرکزیہ مجلس اقبال کے صدر تھے۔ ایڈیٹر چٹان اور خواجہ عبدالرحیم بارایٹ لا معتمدین کو؟؟

اس قرب سے باہمی مطالعہ کا خوب خوب موقع مل۔ آج یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کا دل ایک مومن کا دل تھا۔ وہ اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے تھے۔ کم

زوریاں ہر بشر میں ہوتی ہیں وہ بہ ہر حال میں ایک انسان ہی تھے۔ انھیں نہ تو معصوم عن الخطا ہونے کا دعویٰ تھا نہ وہ محدث و مفسر یا فقیہہ و مفتی تھے۔ لیکن اقبال کے بالاستیعاب مطالعہ نے ان کی فکر و نظر پر ایسی چھاپ لگا دی تھی کہ سیاسیات کی بوقلمونی سے قطع نظر ایک عالمی نظام کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ اقبال کے نقطۂ نگاہ کی بدولت عالمانہ تھا۔ اقبال پر وہ گھنٹوں گفتگو کرتے اور ایک ایک مصرع پر دفتروں کے دفتر کھولتے چلے جاتے تھے۔ یہ عرض کرنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ سیاسیات میں وہ حادثتہ آ گئے تھے۔ اس وادی پر خار کے لیے نہ وہ موزوں تھے اور نہ کانٹوں کی یہ سیج ان کی افتادِ طبع کے حسبِ حال تھی۔

وہ خود آئے نہیں لائے گئے تھے

گورنر فرانس موڈی نے جب انھیں اپنی استعماری مصلحتوں کے تحت ملازمت سے سبک دوش کیا تو ایک بہادر اور غیور انسان کی طرح انھوں نے احوال و مصائب کا مقابلہ کیا۔ یہی چیز انھیں سیاسات میں لے آئی پھر وہ سیاسیات کے ہو گئے اور اب تو وہ کنونشن، مسلم لیگ مغربی پاکستان کے صدر تھے۔ ان کی موت سے اقبالی حلقو میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ ایک ایسا چراغ بجھ گیا جو اقبالی فکر کے ایوانوں میں جگمگاتا رہا۔ جس کا سینہ حرارت دینی سے پر رہا۔ یہ دن ان کی موت کے نہیں تھے۔ یہ دن ان کے بلند و بالا ہونے کے تھے۔

اللہ تعالیٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی موت سے ہم ایسے دوستوں کی انجمن میں زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

۷۔ سماجی خدمات

پناہ گزیں طلبہ کی ویلفیئر سوسائٹی

(REFUGEE STUEDENTS WELFAR SOCIETY)

جب مہاجرین ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان میں آنے لگے تو راجا حسن اختر نے رات دن ان کی بحالی کے لیے کام کیا اور ان کی تمام ضروریات کا خیال رکھا۔ انھوں نے مہاجر طلبہ کی تعلیمی ضروریات پورا کرنے کے لیے ایک سوسائٹی قائم کی۔ یہ بات اس سوسائٹی کے موجودہ جنرل سیکرٹری راجا مسعود اختر ایڈوکیٹ نے حاجی حفیظ الحق مرزا لاء چیمبر میں بیٹھے ہوئے بتائی۔ انھوں نے سوسائٹی کا تمام ریکارڈ دکھایا اور معلومات فراہم کیں۔

راجا مسعود اختر نے بتایا کہ یہ سوسائٹی سٹوڈنٹس ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے ۱۹۴۸ء میں قائم ہوئی۔ ریکارڈ سے معلوم ہوا کہ سوسائٹی ۱۹۵۱ء میں باقاعدہ رجسٹر ہوئی۔ یہ واحد سوسائٹی ہے جو عدالت کے احاطے میں ہے۔ یہ عمارت ۳ مرلے جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔ عمارت ۱۹۸۶ء میں تعمیر ہوئی اور اس پر ساڑھے تین لاکھ روپے لاگت آئی۔ اس وقت سوسائٹی کے پاس ۱۹۹۸ء تک تقریباً ۲۴ لاکھ روپے اخراجات کے علاوہ بچت کھاتے (Saving Account) میں موجود تھے۔ اور اس وقت تک اس ۲۶۲۵ طلبہ و طالبات مستفید ہوئے ہیں اور ایک کروڑ سے زیادی رقم مستحق طلبہ و طالبات کو دی جا چکی ہے۔ ۱۹۹۸ء میں دو لاکھ سے زیادہ کی امداد دی جا چکی ہے۔ پچھلے سال یعنی ۱۹۹۷ء تک امداد کی حدود وہی تھیں جو سوسائٹی کے بانی راجا حسن اختر نے مقرر کی تھیں۔ ۱۹۹۷ء میں اس کے بائی لاز تبدیل کیے گئے اور پاکپتن اور اوکاڑہ کو الگ کر دیا گیا اور امداد صرف ضلع ساہیوال کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ اس سوسائٹی کے قائم ہوتے ہی شیخ فضل محمد ایڈوکیٹ اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے اور ۱۹۹۰ء تک یہ ذمہ داری نباہی اور ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۶ء تک وہ اس کے صدر رہے اور ۱۹۹۰ء سے پہلے ضلع ساہیوال کا ڈی سی سوسائٹی کا صدر ہوتا تھا۔

راجا مسعود اختر کا کہنا ہے کہ انھیں شیخ فضل نے بتایا کہ انھیں راجا حسن اختر

کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ان کا کہنا ہے ''ہم ایک دن اکٹھے بارڈر کی طرف ایک گاڑی میں جا رہے تھے۔راستے میں راجا صاحب نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے عورت اور اس کے چار بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک لڑکی اور تین لڑکے تھے۔راجہ صاحب کو شک گزرا کہ وہ مہاجر ہیں اس عورت کے پاس گئے اور پوچھا ''مہاجر ہو؟'' جواب ''مہاجر ہوں''پوچھا ''مکان چاہیے''عورت خاموش۔ سوال کیا ''زمین چاہیے؟''عورت خاموش ''کچھ اور چاہیے''کوئی جواب نہیں۔راجا صاحب سمجھے کہ ذہنی طور پر معذور ہے۔چلنے لگے تو عورت نے پیچھے سے پکڑ لیا اور کہا بابو ان بچوں کی تعلیم کا کیا ہوگا؟'' راجا صاحب نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش کھڑے رہے۔ میں (شیخ فضل) نے پوچھا راجا صاحب آپ خاموش ہیں فرمایا: ''یار اس عورت نے مجھے نئی سوچ دے دی ہے۔واقعی ہم مہاجروں کو تو آباد کر رہے ہیں لیکن ان کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ نہیں سوچا۔آج سے یہ سوچ بھی ساتھ رکھنا پڑے گی''انھوں نے نائب کورٹ کو پیسے دیے اور حکم دیا ''ان کو کھانا کھلاؤ اور کہیں جانے نہ دو۔ میں واپس آ رہا ہوں'' خود بارڈر پر گئے اور واپسی پر ان کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے آئے اور مہمان خانے میں ٹھہرایا اور اس کے بعد بھی آباد کر دیا۔انھوں نے فوری طور پر مشاورت طلب کی اور مہاجر کے لیے سوسائٹی قائم کر دی جس کا نام (پناہ گزیں طلبہ کی ویلفیئر سوسائٹی) رکھا گیا۔لیکن بعد میں اس کی افادیت کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے اس کا نام ''سوڈنٹس ایڈ کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ'' رکھا گیا اور اس سے غیر مہاجر طلبہ بھی مستفید ہونے لگے۔

اس وقت سوسائٹی کے ممبران کی تعداد ۳۰۰۰ سے زائد ہے۔ان میں امداد دینے والے بھی ہیں اور امداد حاصل کرنے والے بھی ہیں۔سوسائٹی کے لیے امداد کم از کم ایک ہزار روپیہ لی جاتی ہے۔ایک ہزار سے دس ہزار تک امداد دینے والے مخیّر، سرپرست کہلاتے ہیں۔اور دس ہزار سے زیادہ امداد دینے والے نمایاں پہلو

سر پرست کہلاتے ہیں۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۸ء تک ۲۲ سر پرستوں نے دس ہزار یا اس سے زائد رقم دی۔ راجا مسعود اختر نے بتایا کہ ان کی والدہ اور بھائی بھی سوسائٹی کی سر پرستی کر رہے ہیں۔ جو طلبہ اس سوسائٹی سے مستفید ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ۲۶۲۵ ہے اور ان میں سے بعض طلبہ انجینئر، ڈاکٹر، وکلا، پروفیسر، فوجی افسر اور سی ایس ایس افسر بنے ہیں۔ یہ سوسائٹی جب قائم ہوئی تو راجا حسن اختر ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ اس کے پہلے اور بانی صدر تھے۔ راجا صاحب کے بعد جو بھی ڈپٹی کمشنر آتا وہ اس سوسائٹی کا صدر ہوتا تھا یہ سلسلہ ۵۔۶۔۷۵ تک چلتا رہا اور ۵۔۶۔۷۵ کے بعد یہ عہدہ وکلاء کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اب تک یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے اس کے سیکرٹریوں کی تعداد بہت کم ہے۔ سوسائٹی کے قیام (۱۹۴۸ء) سے لے کر ۱۹۰۰ء تک شیخ فضل محمد اس کے سیکرٹری رہے اور ۱۹۹۰ء سے راجا مسعود اختر ایڈووکیٹ اس کے سیکرٹری ہیں۔

ڈی سی آفس کے ریکارڈ کے مطابق راجا حسن اختر ساہیوال کے ۱۲۷ ویں ڈی سی تھے۔ بورڈ پر ان کی آمد کی تاریخ ۶۔۸۔۴۷ اور چارج چھوڑنے کی تاریخ ۲۱۔۱۰۔۴۸ درج ہے۔ راجا صاحب کے بعد ۱۲۸ ویں نمبر پر شیخ انور الحق آئے جو بعد میں چیف جسٹس سپریم کورٹ ہوئے۔ ضلع ساہیوال ۳۔۱۱۔۱۸۴۷ء کو ضلع منٹگمری کے نام سے قائم ہوا۔ اس کا پہلا ڈپٹی کمشنر T.W. Symth تھا۔

سوسائٹی کے بانی اور پہلے صدر راجا حسن اختر تھے ترتیب میں صدور کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ راجہ حسن ختر ڈپٹی کمشنر	۲۔ ایس اے حق
۳۔ جی ایم ڈی جیلانی ڈی سی	۴۔ شیخ انوار الحق ڈی سی پھر سیشن جج اور پھر

چیف جسٹس سپریم کورٹ

۵۔اے ڈی ارشد ڈی سی ۶۔ایس ایم حسن ڈی سی

۷۔آرجی مہدی ڈی سی ۸۔چودھری مشتاق احمد چیمہ ڈی سی

۹۔چودھری نیاز احمد ڈی سی ۱۰۔میاں محمد سعید ڈی سی

۱۱۔ڈی اے جعفری ڈی سی ۱۲۔رفیق عنایت ڈی سی

۱۳۔ایم اے اویس ڈی سی ۱۴۔ایم ایچ شان ڈی سی

۱۵۔مسعود نبی نور ڈی سی ۱۶۔ملک کرم داد ڈی سی

۱۷۔سید مصطفیٰ زیدی ڈی سی ۱۸۔مظفر قادر ڈی سی

۱۹۔طارق جعفری ڈی سی ۲۰۔انوار زاہد ڈی سی

۲۱۔جاوید احمد قریشی ڈی سی ۲۲۔چودھری نذیر احمد ڈی سی

۲۳۔رانا عبدالمجید ایڈووکیٹ سابق وزیر ۲۴۔شیخ نثار احمد ایڈووکیٹ

۲۵۔چودھری فضل الٰہی ایڈووکیٹ ۲۶۔شیخ فضل محمد ایڈووکیٹ

۲۷۔چودھری امداد علی خان ایڈووکیٹ

سیکرٹری

۱۔۱۹۴۸ء سے ۱۹۹۰ء شیخ فضل محمد ایڈووکیٹ

۲۔۱۹۰۰ء سے اب تک راجا مسعود اختر ایڈووکیٹ (۱۹۹۸ء تک)

۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۸ء تک ۱۲۸ سرپرستوں نے تقریباً ایک ایک ہزار روپیہ امداد دی۔ اس سوسائٹی کا پہلا اجلاس ۴۸۔۵۔۱۰ کو منعقد ہوا جس کی کارروائی ایک پرانے رجسٹر پر موجود ہے اور اس پر راجا حسن اختر کے دستخط بحیثیت چیئرمین موجود ہیں۔ ۴۸۔۴۔۱۳ کو پہلی مشاورت ہوئی جس میں یہ سوسائٹی قائم ہوئی اور یہ مشاورت ڈسٹرکٹ بورڈ ہال میں ہوئی۔ اس اجلاس میں جن عہدیداران کا چناؤ کیا

گیا اس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ڈپٹی کمشنر منٹگمری راجا حسن اختر صدر ۲۔پرنسل گورنمنٹ کالج منٹگمری ممبر

۳۔ظفر علی ایڈووکیٹ سیکرٹری سپورٹس ۴۔ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ممبر

۵۔صاحبزادہ نوازش علی ایڈووکیٹ ممبر ۶۔خان مشتاق علی خان مہاجر ممبر

۷۔صاحبزادہ نوازش علی ایڈووکیٹ ممبر ۸۔خان مشتاق علی مہاجر ممبر

۹۔چودھری نذیر امد خان مہاجر ممبر ۱۰۔شیخ شریف حسین ایڈووکیٹ ممبر

۱۱۔شیخ فضل محمد ایڈووکیٹ سیکرٹری (رجسٹر پر پہلے سیکرٹری ظفر علی ایڈووکیٹ لکھے گئے ہیں)

۱۰ مئی ۱۹۴۸ء کو راجہ صاحب نے رجسٹر پر دستخط کیے۔اس سوسائٹی کے پاس ۳۳ لاکھ سے زائد رقم فنڈ میں موجود ہے۔جنرل سیکرٹری روزانہ حساب کی پڑتال کرتے ہیں۔

میں راجا مسعود اختر ایڈووکیٹ، جنرل سیکرٹری کے ساتھ دفتر میں تھا تو ایک طالبہ ثمینہ اختر جو ایم اے اکنامکس میں پڑھ رہی ہے، دفتر میں آئی اور اس کو سوسائٹی کی جانب سے ۱۵۰۰ روپے بہ طور امداد (ناقابل واپسی) دیے گئے۔یہ بچی یتیم ہے اس لیے اس کو ناقابلِ واپسی امداد دی گئی۔اس سوسائٹی کی جانب سے ۲ لاکھ روپے تک بھی امداد دی جاتی ہے۔۲۵ جولائی ۱۹۹۸ء کو ایک میٹنگ میں ایک طالب علم کو ۲ لاکھ روپے بہ طور قرضہ واپسی دیے گئے۔س طالب علم کے والد ساہیوال میں گورداسپور سے آئے۔ان کے راجا حسن اختر مرحوم سے تعلقات تھے۔طلبہ کو امداد بلا سود دی جاتی ہے اور جو امداد قابل واپسی ہوتی ہے وہ دس برابر قسطوں میں واپس کرنا ہوتی ہے۔

سوسائٹی نے ایک پمفلٹ جاری کیا ہے جس پر صدور، ممبران، انتظامیہ اور سرپرست صاحبان (جن کی تعداد ۲۰۸) کا اندراج ہے۔اس پمفلٹ میں سوسائٹی کی سرگذشت بھی ہے جس میں یہ الفاظ سوسائٹی کے قیام کے حوالے سے دیکھے جا سکتے

ہیں۔

یہ ۱۹۴۸ء کے اوائل کی بات ہے جب اس نوزائیدہ مملکت کا تعلیمی و تدریسی نظام اپنے ابتدائی دشوار گذار مراحل میں تھا اور ملک کے ایک بڑے حصے کو تسلیم کی نسبت جائدادیں الاٹ کروانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ان حالات میں اس سوسائٹی کا قیام ایک معجزے سے کم نہیں تھا۔ مکرم و محترم راجا حسن اختر مرحوم جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس وقت ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کی محنت اور کوششوں سے سوسائٹی کے فنڈ میں ایک خطیر رقم جمع ہوگئی جس میں سے ۵۰ فیصد مہاجر طلبہ کی تعلیمی ضروریات پر صرف کی گئی۔

۹۷۔۱۹۹۶ء کی سالانہ رپورٹ جو راجا مسعود اختر، جنرل سیکرٹری نے ۲۹ دسمبر ۱۹۹۷ء کو پیش کی اور اس میں راجا حسن اختر مرحوم کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

سٹوڈنٹس ایڈ کواپریٹو سوسائٹی ساہیوال کے کارکنان ہر سال اپنے بانی و مکرم محترم راجا حسن اختر مرحوم کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے آج بھی نذرانۂ عقیدت و تشکر پیش کرتے ہیں۔ جس وقت سوسائٹی ہذا کی بنیاد رکھی گئی اس وقت پاکستان کا پورا تدریسی نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور ایسے ادارے کا اجرا ناگریز تھا۔ سوسائٹی ہذا کا اولین بنیادی مقصد تعلیم کے میدان میں ان ضرورت مند مگر ہونہار طلبہ و طالبات کے مستقبل کو محفوظ بنایا تھا جو پسماندگی اور جہالت کے اس دور میں علم کے چراغ روشن رکھنا چاہتے تھے۔

۸۔ سیاسی خدمات

راجا حسن اختر مصورِ پاکستان کی منزل ہی کو اپنی منزل سمجھتے تھے اور یہ سب کچھ کلامِ اقبالؒ اور صحبتِ اقبالؒ کا فیض تھا۔ جس طرح اقبالؒ اپنے آپ کو قائداعظمؒ کا سپاہی کہتے تھے، اسی طرح راجا حسن اختر مسلم لیگ، تحریک پاکستان اور قائداعظم

کے سپاہی تھے۔ وہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود دفتر میں بیٹھ کر مسلم لیگ کے لیے کام کرتے تھے۔

کلام اقبال ؒ کی تاثیر تھی کہ انھوں نے انسانیت سے پکا رشتا جوڑ لیا۔ وہ ہر انسان کی قدر کرنے لگے۔ ان کے نزدیک امیر و غریب میں کوئی فرق نہ تھا۔ بعض اوقات راجا صاحب فرائض منصبی کی انجام دہی کے باعث تھکے ہارے ہوتے اور آدھی رات کو عام آدمی ملنے آ جاتے تو آپ کبھی برا نہ مناتے۔ اہل خانہ اگر ان لوگوں پر ناراض ہوتے تو راجا صاحب کہتے: کوئی بات نہیں بے چارے کسی غرض سے آئے ہوں گے۔

حسین شہید سہروردی نے ایک سیاسی جماعت بنائی، جس کا نام عوامی لیگ رکھا گیا۔ راجا صاحب نے یہ کہہ کر اس میں شمولیت نہ کی: کہ جس پارٹی کے نام میں جناح ؒ اور مسلم لیگ کا لفظ شامل نہیں، میں اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ سہروردی ناراض ہو گئے اور راجا وزیر نہ بن سکے۔ راجا نے کہا میرا قلبی مسئلہ یہ ہے کہ مسلم لیگ، قائداعظم ؒ اور پاکستان سے ہٹ کر کوئی عہدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

راجا حسن اختر ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ جب انھوں نے الیکشن لڑنے کا ارادہ کیا تو بھاری اکثریت سے کام یاب ہوئے۔ ایم۔ این۔ اے ہونا راجا صاحب کی قد آور شخصیت کے آگے کوئی غیر معمولی حیثیت نہ تھی۔ جب وہ ایم این اے نہیں تھے تو بھی ان کا ہر محکمے میں اثر و رسوخ تھا۔ وہ لوگوں کے کام بڑی محبت اور خلوصِ نیت سے کرتے تھے۔ وہ پکے مسلم لیگی تھے۔ جہاں بھی تبادلہ ہوتا وہ وکیلوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے اور مسلم لیگ کا گروہ تیار کرنے میں لگے رہتے۔ وہ اپنی افسری کو مسلم لیگ کے لیے استعمال کرتے تھے اور اپنے سرکاری دفتر میں بھی مسلم لیگ کے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۹ء تک اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور مسلم لیگ کے لیے بہت کام کیا۔ بڑے بڑے لوگ آج بھی ان کی خدمات کے

معترف ہیں۔ مسلم لیگ سے انھیں عشق تھا۔ انھوں نے تحریک پاکستان کے لیے بھی بہت کام کیا۔ ان کے محمد حسین چٹھہ، میاں امیر الدین، حمید نظامی، جسٹس کیکاؤس، نواب ممدوٹ وغیرہ سے خاص مراسم تھے۔

جس زمانے میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان برسرِ اقتدار تھے اس وقت مسلم لیگ کے دو دھڑے تھے۔ کونسل مسلم لیگ (محترمہ فاطمہ جناح) اور کنونشن مسلم لیگ (صدر ایوب خان) جب صدارتی انتخابات سامنے آئے تو راجا حسن اختر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پوری حمایت کر رہے تھے۔ کونسل مسلم لیگ نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی پوری حمایت کر رہے تھے۔ کونسل مسلم لیگ نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کو سامنے لانا کا فیصلہ کیا۔ جب راجا صاحب کو اس کا پتا چلا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے:

میری عجیب حالت ہے، ایک طرف صدر ایوب کا ساتھ نبھانے کا عہد کیا ہے دوسری طرف مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کا احترام ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔

انھوں نے صدر ایوب خان کا ساتھ دیا لیکن بہت پریشان رہے۔ ایوب خان کے دور میں وہ مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر رہے۔ وہ کافی با اختیار تھے۔ راجا صاحب بڑی قد آور شخصیت کے مالک تھے۔ حسن اختر روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ مسلم لیگ کے لیے ان کے ہر فیصلے کا احترام کیا جاتا تھا۔ وہ جنون کی حد تک مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستہ رہے۔ تمام مسلم لیگی ان کی خدمات کے معترف تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔

راجا حسن اختر کا شمار تحریک پاکستان کے بانیوں میں سے تھا۔ انھیں مغربی پاکستان مسلم لیگ کا صدر اور مسلم لیگ کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ انھوں نے ہر لمحہ عوام کی خدمت کی۔ پنجاب حکومت نے ان کی قومی خدمات کے اعتراف میں تحریک پاکستان کا گولڈ میڈل بھی دیا گیا۔

حوالے

۱۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، روالپنڈی، مکتبہ حسن اختر، ص۔ ۱۷

۲۔ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، ایکسٹریکٹس فرام دی ڈسٹرکٹ اینڈ سٹیٹ گیزیٹیر لاہور، یونی ورسٹی آف پنجاب ۱۹۸۳ء، ص، ۲۵۷

۳۔ ایضاً، ص، ۲۶۴۔

۴۔ ایضاً، ص، ۲۷۵

۵۔ ؟؟؟؟

۶۔ رائے زادہ دنی چند، مترجم راجہ محمد یعقوب طارق، کیگو ہرنامہ، ص، ۱۵۔

۷۔ عزیز ملک، پوٹھوہار، اسلام آباد، لوک ورثے کا قومی ادارہ، ۱۹۷۸ء، ص، ۱۵۶

۸۔ رائے زادہ دنی چند کیگو ہرنامہ، ۱۹۸۶ء، ص، ۱۲۷۔۱۲۶۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔۱۲۲۔

۱۰۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص، ۱۶۸

۱۱۔ ریسرچ سوسائٹی ڈسٹرکٹ اینڈ سٹیٹس گیزیٹیر ز۔ ص، ۲۸۳

۱۲۔ ایضاً، ص، ۲۸۳

۱۳۔ غلام اکبر ملک، گکھڑ اور کھوکر، العقاب پبلکیشنز، ۱۹۹۶ء، ص، ۱۲۹

۱۴۔ ایضاً، ص، ۱۳۶

۱۵۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص، ۱۶۷

۱۶۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص، ۹۔۸

۱۷۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص، ۱۶۸

۱۸۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص، ۱۷۲

۱۹۔ اقبالؒ، کلیات اقبالؒ اردو، لاہور، اقبال اکادمی و بزم اقبالؒ ۱۹۹۴ء۔ ص ۳۵۳۴۹

باب دوم

راجہ حسن اختر کی اقبال شناسی اور باہمی روابط

- اقبال سے قریبی مراسم
- اقبال سے ملاقاتوں کا بیان
- اقبال سے عقیدت
- اقبال کے آخری ایام
- مزارِ اقبال اور یوم اقبال کا ذکر
- اقبال شناسی فکری اور شعوری اثاثہ

IqbalCyberLibrary All rights reserved. ©2002-2006

راجا حسن اختر کی اقبال شناسی اور باہمی روابط

۱۔ اقبال سے قریبی مراسم

راجا حسن اختر کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ انھیں زندگی میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ کا قربِ خصوصی حاصل رہا ہے۔

راجا حسن اختر ۱۹۳۴ء میں گجرات میں جب مجسٹریٹ تھے، ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ راجا صاحب حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے شیدائیوں میں سے تھے، گجرات سے لاہور پہنچے اور حضرت علامہ محمد اقبالؒ کو ولادت کی خوش خبری سنائی۔ اُنھوں نے پوچھا۔ نام تو نہیں رکھا؟ راجا صاحب بولے، نہیں.......... علامہ گہری سوچ میں کھو گئے، چند لمحوں بعد چونک کر فرمایا: ''مسعود اختر''

پھر ایک روز راجا صاحب، ننھے مسعود اختر کو حضرت علامہ اقبالؒ کے ہاں لے گئے...... علامہ اقبالؒ نے ننھے کو گود میں لے کر بڑے پیار سے کہا، ''مسعودی'' اُس روز کے بعد میجر مسعود اختر شہید گھر بھر میں اور پاک فوج میں ''مسعودی'' کے نام سے پکارے جاتے رہے۔

راجا حسن اختر کے بڑے بیٹوں کے نام ''اختر علی'' اور ''عابد علی'' تھے مسعود کے نام رکھنے کے بعد ان دونوں کے نام بھی تجویز کرنے کی گذارش کی گئی۔ تو حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے ''اختر علی'' کا نام ''ظہور اختر'' اور ''عابد علی'' کا نام ''محمود اختر'' تجویز کیا:

سید اکبر کاظمی راجا صاحب کے شہید بیٹے مسعود اختر سے مخاطب ہوئے:

کہتے ہیں کہ اقبال نے رکھا تھا ترا نام
لازم تھا کہ جرات ہو تیری زیست کا انجام

اقبال کا شاہیں تھا تو ملت کا ستارا
تیرا رُخِ کردار ہے فطرت کا اشارا"[1]

حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال "خراج" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

راجا حسن اختر کا فرزند جس کا نام علامہ اقبالؒ نے مسعود تجویز کیا اور جس نے اپنی سپاہیانہ زندگی کی منتخب کی، آخر محبِ وطن مسلمان اس سے کیا توقع رکھ سکتے تھے، یہی کہ وہ سرزمین پاکستان حفاظت کی خاطر اپنی جان دے گا۔ اُس نے اس سرزمین کی حفاظت کے لیے اپنی جان دی اور کہا دی؟ شہر اقبال یعنی سیال کوٹ کے تحفظ کے دوران راجا حسن اختر اگر آج زندہ ہوتے تو مسعود کی شہادت پر اُسے شاباش نہ دیتے۔ کیوں کہ یہ تو اس سے متوقع تھا، اس کی تربیت اور فطرت کے عین مطابق عمل تھا جسے کوئی اہمیت نہیں دی جانی چاہیے۔ زندہ لوگوں کو انجام دینے کے لیے بہت سے ایسے اہم فرائض ہیں جو ہمیشہ باقی رہتے ہیں اور جو لوگ اہم فرائض انجام دیتے ہیں بھلا وہ کب مرتے ہیں[2]

ڈاکٹر جاوید اقبال کی اس تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راجا حسن اختر اور حضرت علامہ اقبالؒ کے اتنے قریبی مراسم تھے کہ حضرت علامہ اقبالؒ نے راجا صاحب کے بیٹے کا نام خود تجویز فرمایا اور پھر مسعود شہید کی شخصیت کا جو عکس جاوید اقبال نے پیش کیا اس پر تعلیمات اقبال کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ اقبال سے ملاقاتوں کا بیان

اس طرح ایم ایس ناز نے اپنی تالیف حیات اقبال میں "یارانِ محفل" میں نقل کیا ہے:

چودھری محمد حسین تو برس ہا برس سے علامہ کے مخلص دوستوں میں شامل تھے۔ جب کہ مرتضیٰ احمد خان میکش، حکیم محمد حسن قرشی، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ ہوشیار

پوری، راجا حسن اختر، منشی محمد دین فوق، سید نذیر نیازی، میاں محمد شفیع اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی اکثر بیشتر علامہ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے۔ سید امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد، میاں بشیر احمد اور پروفیسر حمید احمد خان کو بھی کئی بار علامہ کی محفلوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔[۵]

ایک بار حضرت علامہ اقبالؒ حالی کی مسدس کے صدی ایڈیشن کی تقریب میں شرکت کے لیے ۱۹۳۵ء میں پانی پت تشریف لے گئے اور راجا حسن اختر بھی ان کے ہم راہ تھے اُن کا بیان ہے:

صدی کے جشن مبارک کی تقریب (مسدس کا صدی ایڈیشن) ۱۹۳۵ء میں منائی گئی۔ حضرت علامہ بھی تشریف لے گئے۔ میں بھی ہم راہ تھا تقریب کے خاتمہ پر منتظمین کی طرف سے مدعوئین کی فوٹو کا انتظام کیا گیا۔ فوٹو کے لیے حضرت علامہ اقبال کی کرسی صدر جلسہ نواب صاحب بھوپال کے ساتھ رکھی گئی۔ اس بات کی اطلاع مولانا حالی مرحوم کے صاحب زادے نے ہمیں دی۔ حضرت علامہ یہ سُن کر وہاں سے چل دیے اور اپنی جائے رہائش پر پہنچ گئے۔ وہاں سے سامان لے کر سٹیشن پر پہنچے۔ میں حیران تھا کہ فوٹو میں شامل ہونے سے آپ نے کیوں اجتناب فرمایا ہے۔ ویٹنگ روم میں علی بخش نے حقہ تازہ کر کے پیش کیا۔ آپ نے ہلکے ہلکے کش لگانا شروع کر دیے۔ میں نے تصویر میں نہ شامل ہونے کے معمہ کو معلوم کرنے کی غرض سے پوچھا کہ ہمارے علماء کے نزدیک فوٹو کھنچوانا حرام ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ علامہ بولے! بات تو صحیح ہے مگر دلیل غلط ہے۔ میں نے عرض کیا صحیح دلیل کیا ہے؟ فرمانے لگے۔ صحیح دلیل یہ ہے کہ مومن کو بے مثال ہونا چاہیے۔

ایم۔ ایس ناز نے راجا حسن اختر کی ایک روایت اپنی کتاب حیاتِ اقبال میں نقل کی ہے:

ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا تھا۔ ایک دن علامہ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ روزانہ باتیں کرتا ہے۔ علامہ ہنس کر کہنے لگے، خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو۔ وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے۔ اس نے کہا میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو پایۂ تخت بناؤں گا۔ علامہ فرمانے لگے ہم تو غالباً اُس وقت موجود نہ ہوں گے۔ البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اُسے ضرور بخش دینا۔ علامہ کے مرض الموت میں یہ شخص حاضر ہوا اور کہنے لگا، آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔

علامہ ہنسے اور کہنے لگے، واہ! ہم آپ کو نہ پہچانیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔[۲]

سید اکبر علی کاظمی حسن اختر کو ان کے بیٹے کی شہادت پر منظوم خراج عقیدت پیش کرتے ہیں، جس میں حضرت علامہ اقبالؒ اور راجا صاحب کے تعلقات کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

اقبال کا ہم راز سیاست کا طرح دار
راجا حسن اختر وہ صداقت کا پرستار
وہ مردِ خدا جس کا عمل روحِ انا تھی
وہ جس کے تفکّر میں ادب کی بھی ضیا تھی
وہ قوم کا ہم درد وہ ملّت کا پرستار
تا زیست جو کرتا رہا اخلاص کا اظہار

۳۔ اقبال سے عقیدت

فرزند اقبالؒ ڈاکٹر جاوید اقبال حضرت علامہ کے عقیدت مندوں کا ذکر کرتے ہیں:

فرزند ایام میں اقبالؒ کی خدمت میں اکثر و بیشتر موجود رہنے والے عقیدت بند میاں محمد شفیع، سید نذیر نیازی، چودھری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، راجا حسن اختر اور ڈاکٹر عبدالحمید تھے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ بھی بسا اوقات اُنھیں دیکھنے کے لیے آ

جاتے تھے۔ بعض اوقات راجا حسن اختر اپنے ساتھ سجاد سرور نیازی کو لاتے اور سجاد سرور نیاز اقبالؒ کو غالب، حالی یا اُن کا اپنا کلام ہارمونیم کے ساتھ گا کر سناتے۔[5]

انقلاب ۱۶؍دسمبر ۱۹۲۸ء کے سنڈے ایڈیشن میں منشی تلوک چند محروم کے اشعار اس عبارت کے ساتھ چھپے ہیں:

جانم در آویخت با روزگاراں
جناب منشی تلوک چند محروم بی اے[6]

جناب راجا حسن اختر صاحب ای اے سی کے ارشاد پر منشی تلوک چند صاحب محروم نے حضرت علامہ اقبالؒ کے ایک شعر پر چند اشعار ارشاد فرمائے ہیں جو درج ذیل ہیں:

انداخت در دم در رہگزاراں
از چارہ فتم اے چارہ کاراں
ہم اشک باراں ہم راہ سپاراں
بے راز داراں بے غم گساراں
جانم در آویخت بار وزگاراں
جوئے ست نالاں در کوہساراں[7]

راجا حسن اختر کے دل میں علامہ اقبالؒ کی محبت راسخ ہو گئی تھی۔ راجا صاحب سے ملنے والا ہر شخص جانتا تھا کہ کبھی ان کے منہ سے علامہ اقبالؒ کا نام یعنی کلمۂ اقبالؒ نہ نکلا تھا۔ وہ ہمیشہ حضرت علامہ اقبالؒ کہتے تھے۔ جو لوگ ڈاکٹر اقبالؒ یا صرف اقبال کہتے تھے۔ راجا صاحب انھیں کوتاہِ ادب جانتے تھے۔ علامہ اقبالؒ سے اُن کی عقیدت آخر دم تک قائم رہی۔ انھیں علامہ اقبالؒ کے بلا مبالغہ سیکڑوں اشعار ازبر تھے۔

اقبالؒ اور کلام اقبال سے راجا حسن اختر کی عقیدت محض سطحی اور رسمی نہ تھی۔ بل کہ یہ عقیدت جنون کی حد تک تھی۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

راجا حسن اختر کا شمار اُن گنے چنے جوانوں میں ہوتا تھا جو حضرت علامہ اقبالؒ سے والہانہ عقیدت اور ارادت رکھتے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں قیام ہوتا تو ہر شام وہ حضرت کے ہاں حاضری دیتے، اگر تعیناتی لاہور سے باہر ہوتی تو جب کبھی لاہور آنا ہوتا تو اوّلین فرصت میں علامہ کے ہاں حاضری دیتے تھے۔

۴۔اقبال کے آخری ایّام

راجا حسن اختر کی خوش بختی کہ انھیں حضرت علامہ اقبالؒ کے آخری ایام میں، اُن کی خدمت گزاری کا اُنھیں موقع ملا۔

ایم۔ایس ناز نے اپنی کتاب حیات اقبال میں اپنے مقالہ ''اقبال کا سفر آخرت'' میں لکھا ہے:

حکیم قرشی صاحب نے بعض دوائیں تلاش کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی تو راجا حسن اختر صاحب موٹر کی تلاش میں نکلے۔ ادھر ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ کرنل امیر چند صاحب کو بھی مشورہ میں شامل کرلیا جائے ،کرنل صاحب جب تشریف لائے تو ان کی حالت قدرے سنبھل گئی تھی۔ ۵

ایم۔ایس ناز مزید رقم طراز ہیں کہ:

میں محمد شفیع تو مستقل طور پر جاوید منزل ہی میں اُٹھ آئے تھے اور رات بھر جاگ کر علامہ کو دوائیں کھلایا کرتے تھے۔

آدھی رات تک چودھری محمد حسین، راجا حسن اختر، حکیم قریشی صاحب بیٹھے ہوئے علامہ کا دل بہلاتے رہتے۔ حضرت علامہ کو اپنے احباب کے جذبہ خدمت گزاری متشکرانہ احساس تھا اور وہ خلوت میں اُس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے۔

راجا حسن اختر تو اقبال کی وفات کے وقت آخری سانس تک اُن کے ساتھ

رہے اور جی بھر کے اپنے محسن کی خدمت گزاری کی۔

عبدالمجید سالک حضرت علامہ کے مرض الموت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے ان حالات کے لیے سید نذیر نیازی کے بیان پر تکیہ کیا (ذکر اقبال حاشیہ ص۔۲۲۳) وہ لکھتے ہیں:

علامہ کو خیال آیا کہ حکیم قرشی صاحب شام سے بھوکے بیٹھے ہیں، کھانا نہیں کھایا، آپ نے علی بخش سے کہا کہ حکیم صاحب کو بسکٹ کھلاؤ اور چائے پلاؤ۔ چودھری محمد حسین، حکیم قرشی صاحب، سید سلامت اللہ شاہ اور سید نذیر نیازی خدمت میں حاضر تھے۔ راجا حسن اختر کے متعلق دریافت فرمایا تو بتایا گیا کہ وہ ایک کام سے گئے ہیں۔ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آئے، مگر اس کے پیتے ہی علامہ کا جی متلانے لگا۔ اس پر حکیم صاحب نے خمیرہ گاؤزبان عنبری کی ایک خوراک دی جس سے طبیعت بحال ہوگئی۔

جب ان کے ہم نشین حضرات نے دیکھا کہ علامہ مائل خواب ہیں تو انھوں نے اجازت طلب کی۔ اُس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

راجا حسن اختر اس وقت جاوید منزل پہنچ گئے تھے۔ علامہ کچھ دیر تک سوتے رہے۔ پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی اور فرمایا! قرشی صاحب کو بلا لاؤ۔ راجا صاحب نے کہا وہ ایک بجے یہاں سے گئے ہیں شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو۔ اس پر فرمایا! ''کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو انھوں نے گذشتہ دسمبر میں کہی تھی۔

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟[۵۹]

راجا صاحب یہ سُن کر حکیم صاحب کو بلانے چلے گئے۔ یہ واقعہ پانچ بج کر پانچ منٹ کا ہے۔ حضرت علامہ خواب گاہ میں آ گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ہدایت فروٹ سالٹ تیار کیا۔ حضرت علامہ نے فرمایا اتنا بڑا گلاس کیوں کر پیوں گ؟ اور پھر چُپ چاپ سارا گلاس پی گئے۔

علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی۔ اس وقت علی بخش کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ علامہ نے اس سے فرمایا! میرے شانوں کو دباؤ۔ پھر لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا لیے اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہا! یا اللہ! یہاں درد ہے، اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف کرنے لگا۔ علی بخش نے بڑھ کر سہارا دیا۔ تو سوا پانچ بجے صبح حضرت حکیم الامت نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخ رو حاضر ہو گئے۔[۱۸]

۵۔ مزارِ اقبال اور یوم اقبال کا ذکر

۱۹۳۸ء میں جاوید منزل میں مزار کمیٹی کی تشکیل کے لیے اجلاس ہوا اور اس میں چودھری محمد حسین کو صدر مقرر کیا گیا اور خواجہ عبدالرحیم سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کے ممبران میں حکیم قریشی، میاں امیر الدین، راجا حسن اختر، حمید نظامی اور شیخ محبوب الٰہی شامل تھے۔

چودھری محمد حسین کے بعد راجا حسن اختر مزار کمیٹی کے صدر مقرر ہوئے۔ مزارِ اقبال میں علامہ اقبال کے اشعار لکھوانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے ممبران چودھری محمد حسین، راجا حسن اختر اور خواجہ عبدالرحیم تھے۔

میاں امیر الدین رقم طراز ہیں:

حضرت علامہ اقبالؒ کے مزار کی تعمیر کے لیے مرکزی مجلس اقبالؒ کے ارکان اور عقیدت مندوں نے حسبِ حیثیت دل چسپی لی۔

مزار کی تعمیر میں سرکاری یا کسی نیم سرکاری ادارے یا تجارتی ادارے کی مدد شامل

نہیں۔ راجا صاحب نے بھی ہمت کے مطابق اور بعض اوقات ہمت سے بڑھ کر مالی تعاون کیا۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے مزار کی تعمیر ان کے عقیدت مندوں کا ایک تاریخی کارنامہ اور اس میں راجا صاحب پیش پیش رہے۔ رہ بھی کیسے سکتے تھے، یہ ان کے مرشد کی یادگار تھی۔[۱۱]

مزار اقبال میں دل چسپی کے ساتھ ساتھ راجا حسن اختر یوم اقبال کو قومی حیثیت دلوانے میں بھی پیش پیش رہے۔ وہ یومِ اقبال میں اپنے مقالے پڑھتے تھے اور اپنے احباب کو بھی کلام اقبال کی دعوتِ فکر دیتے تھے؛ پروفیسر محمد منور مرزا رقم طراز ہیں:

پروفیسر محمد منور مرزا جو اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے ناظم رہے۔ انھیں راجا حسن اختر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور نشست و برخاست بھی رہی۔ انھوں نے ایک ملاقات میں خود بتایا کہ راجا صاحب نے ہی ان سے یوم اقبال پر تقریر کروائی اور اقبالیات کی دنیا میں جو شہرت انھیں حاصل ہے اس کا سبب راجا صاحب تھے۔

ان کا راجا صاحب کی وساطت سے مجلسِ اقبال سے رابطہ ہوا اور بقول اُن کے "میرا مجلسِ اقبال سے رابطہ ہوا اور لاہوریوں نے مجھے اقبالی نیازمند کے طور پر دیکھا۔ ان کے ساتھ راجہ صاحب کی یاد موجود ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میزان اقبال میں حرف آغاز کے زیر عنوان تحریر کیا ہے:

میرے محترم دوست راجا صاحب نے علامہ اقبالؒ کے فکر و بیان کے ساتھ میری محبت کو جنون میں بدل دیا تھا۔ وہ میرے جنوں کی داد بھی دیتے تھے اور ہمت بھی بڑھاتے تھے۔ مرحوم دل گرم کے مالک تھے اور مجسم شفقت۔ ان کی یاد تا حال خارِ رگ جاں ہے چناں چہ میں نے اقبالیات کے ضمن میں اپنے اس پہلی تالیف کو انھی کے نام نامی سے منسوب کیا ہے۔[۱۲]

گویا کہ راجا حسن اختر کے دل میں کلامِ اقبال سے عقیدت واحترام کا جو جذبہ جاگزیں تھا وہ اس جذبے کو اپنے احباب کے دل و دماغ میں سمانا چاہتے تھے۔

۶۔ اقبال شناسی فکری اور شعوری اثاثہ

یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ راجا حسن اختر حضرت علامہ محمد اقبالؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اسی قربت اور ارادت مندی نے ان کے **قلب** و ذہن کو تبدیل کر دیا تھا۔

فکری سفر میں راجا صاحب نے نئی سمت کا تعین کیا اور پکے افکارِ اقبال سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ اقبال شناسی اُن کا شعوری اور فکری اثاثہ تھا۔ حضرت علامہ محمد اقبال کی محفلوں میں بیٹھنا ان کی وجدانی تربیت کا عمل تھا۔

کلام اقبال کا پڑھنا، سننا اور سنانا ان کی عبادت میں شامل تھا۔ کلام اقبال کے مفاہیم و مطالب سے آگاہی حاصل کرنا اور اقبالؒ کا آفاقی پیغام دوسروں تک پہنچانا ان کے لیے باعث سکونِ **قلب** تھا۔ ان کی بیٹیوں کا کہنا ہے کہ جب وہ چھوٹی تھیں تو راجا حسن اختر ان کو گود میں بٹھاتے، پیار کرتے، علامہ اقبالؒ کے اشعار ترنم سے پڑھتے اور ساتھ ساتھ جھومتے تھے۔

راجا حسن اختر گھر کی چار دیواری میں ہو یا احباب کی محفل میں کلام اقبال کو اپنی گفتار کا حصہ بنالینا اُن کا وتیرہ تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اُن کی زبان سے کلام اقبال سے پھول جھڑنا شروع ہو جاتے تھے۔

وہ جس مناسبت سے کلام اقبال کا تذکرہ چھیڑتے تھے ایسا لگتا تھا کہ افکارِ اقبال اُن کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی تھی۔ اُن کی زندگی کے چند واقعات ملاحظہ فرمائیں، آپ کو اندازہ ہوگا کہ اقبال شناسی راجا حسن اختر کا فکری اور شعوری اثاثہ تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد گلزار کا بیان ہے: مشہور وانٹس ہوٹل جس میں پاکستان کا

پارلیمانی وفد قیام پذیر تھا، اس کے سربراہ راجا حسن اختر صاحب ممبر نیشنل اسمبلی تھے۔ میں ان دنوں لندن میں تھا۔ قبلہ راجا صاحب سے ملنے کے لیے شام کو ان کے پاس گیا۔۔۔ اُس وقت راجا صاحب کے چند احباب بھی موجود تھے جنھیں وہ اہل مغرب کے متعلق اپنے تاثرات بتارہے تھے۔ اُسی روز صبح بی بی سی لندن میں اُن کا ایک انٹرویو بھی ریکارڈ ہوا تھا۔ جس میں دوسرے امور کے علاوہ انھوں نے علامہ اقبال کے ان تصورات کا بھی ذکر کیا تھا جس میں بتایا گیا ہے کہ اہل مشرق کس طرح مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات حاصل کرسکتے ہیں؟ جس کا ذکر حضرت علامہ اقبال نے تفصیل سے اپنی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق میں کیا ہے۔

اسی سلسلے میں میجر مسعود اختر نے دریافت کیا کہ موجودہ حالت میں ہمارے لیے صراطِ مستقیم کیا ہے؟ جس پر راجا صاحب نے پاکستان کی تحریک پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: جس طرح قائدِ اعظمؒ نے نامساعد حالات کی موجودگی میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد ڈالی جو حضرت علامہ اقبال کے فکر بلند کی عملی تصویر تھی۔۔۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا سپاہ گری کے مقابلے میں علم وفراست کا درجہ کم تر ہے۔ علامہ اقبال نے بھی یہی فرمایا ہے۔

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را! [13]

اسلام کی تاریخ سے یہی واضح ہوتا ہے کہ زورِ حیدری کے حصول ہی سے تمام مشکلات ومسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت علامہ اقبال کا ارشاد ہے۔

مرے لیے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک [14]

اس وقت انھوں نے علامہ اقبال کی وہ نظم پڑھی جس میں حضرت علامہ اقبال نے سالارِ اسلام طارق کے متعلق اُن جذبات کا اظہار کیا جوان کے دل میں اندلس میں داخلہ کے وقت موج زن تھے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت اُن کی نظر میں[۱۵]

اس کے بعد راجا صاحب نے فرمایا کہ جہاں تک دفاع میں حصہ لینے والے نوجوانوں کے کردار کا تعلق ہے اس کی تفسیر حضرت علامہ اقبال نے ان اشعار میں کس خوبی سے کی ہے:

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری[۱۶]

لیفٹینینٹ کرنل محمد گلزار نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ وائٹس ہوٹل لندن کی ملاقات میں راجا حسن اختر صاحب نے کہا کہ بقول اقبال:

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے[۱۷]

بقول کرنل محمد گلزار

قبلہ راجا صاحب اس موضوع پر گفتگو کر رہے تھے تو میجر مسعود اختر نے مجھے کہا کہ ملک وملت کی خدمت کرنے میں خدا انھیں بھی اسلامی اور خاندانی روایات پر پورا اترنے کی توفیق دے۔

راجا صاحب نے اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ایسے علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں کے باشندے اگرچہ اقتصادی طور پر فارغ البال نہیں لیکن سپاہ گری ہمیشہ سے ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور اس پر وہ بجا طور پر نازاں بھی ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی [۱۸]

۔۔۔راجا عجیب قلندر صفت انسان تھے۔ ملازمت کی تو اس شان سے کہ اپنی ذات پر قومی مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا حضرت علامہ اقبال کی ذات سے بے پناہ عقیدت اور ان کی خدمت میں مستقل اور متواتر حاضری نے مزاج میں فقر و استغنا کی صفات پیدا کر دیں۔۔۔ دو بیٹے قومی خدمت کے لیے فوج کو دیے۔۔۔ ان میں سے ایک ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہید ہوا۔ تیسرا بیٹا محکمہ خوراک میں اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کی حیثیت سے ملازم ہوا، اگر چاہتے تو اس بیٹے کو ترقیاں دلوا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے۔ مگر جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آنے کا خدشہ ہو اُسے قبول نہ کیا اور قبول کرتے بھی کیسے کیوں کہ مرشد نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ایسے رزق سے موت اچھی ہے۔۔۔ مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش کی، میں نے ایک نئی غزل کے شعر سنانے شروع کیے!

میں حدِ آرزو سے بھی آگے نکل گیا
وہ منتظر رہے مرے دستِ سوال کے

تو بے انتہا داد دی اور کہنے لگے! اقبال کی شاعری کے بعد میں نے شعری

مطالعے سے بہت کم رغبت رکھی ہے۔ لیکن آپ کے اشعار سن کر اندازہ ہوا کہ کاروانِ شعر کسی مقام پر رکتا نہیں اور حضرت علامہ نے کہا ہے کہ ''ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود'' تو ہم کاروانِ وجود کی جگہ ''کاروانِ غزل بھی کہہ سکتے ہیں:

۔۔۔جس زمانے میں لاہور میں طالب علمی کی زندگی گزار رہا تھا۔ حضرت علامہ اقبال کا آفتاب زندگی لبِ بام تھا۔ میری اس زمانے میں شاعرانہ حیثیت کچھ نہ تھی کہ میں ان کی خدمت میں حاضری دیتا، تاہم راجا صاحب نے اپنی جوانی کا زمانہ حضرت علامہ کی خدمت میں خوب خوب گزارا اور بسا اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ حضرت علامہ نے اپنا وہ مشہور شعر شاید راجا صاحب کی ذات سے ہی متاثر ہو کر لکھا ہے جو اس طرح سے ہے کہ:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی[۱۹]

پروفیسر محمد منور مرزا نے ایک مضمون بندۂ مومن راجا حسن اختر کے لیے لکھا اس میں یہ ذکر کیا گیا ہے!

راجا عبدالقادر کے راجا حسن اختر سے عزیزانہ مراسم تھے۔ یوں غائبانہ تو میں بھی راجا صاحب کو جانتا تھا۔ حضرت علامہ کا کوئی نیاز مند راجا صاحب کے نام سے کیوں کر واقف رہ سکتا تھا۔۔۔ میں نقل مکانی کر کے جناح کالونی کے ایک چوبارے میں جا پڑا تھا وہاں رہتے کوئی ڈیڑھ سال ہوا ہوگا کہ راجا حسن اختر صاحب گورنمنٹ کالج لائلپور میں تشریف لائے۔ کالج یونین کے زیر اہتمام ''یوم اقبال'' منایا گیا تھا۔ راجا صاحب کی صدارت تھی۔ آنکھیں زیارت کی مشتاق تھیں۔ زیارت ہوگئی، جی خوش ہو گیا، میں نے بھی مقالہ پڑھا اور اجلاس ختم ہوتے ہی گھر کی راہ لی۔۔۔

دوپہر کے تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ مجھے گھر پہنچے کوئی آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ راجا

عبدالقادر صاحب حملہ آور ہوئے۔ ''تم بھاگ کیوں آئے! راجا صاحب نے جلسہ ختم ہوتے ہی پوچھا وہ صاحب جنھوں نے فلاں موضوع پر مقالہ پڑھا تھا کہاں ہیں؟۔۔۔ راجا صاحب کو بتایا کہ وہ تو چلے گئے ہیں اُنھوں نے کہا میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ان کے گھر لے چلو''۔۔۔ میں نیچے اُترا تو راجا صاحب نے کار سے نکل کر گلے لگالیا اور اس زور سے بھینچا کہ کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔[۴۹]

پروفیسر عبدالقادر کے تاثرات ملاحظہ کیجیے!

حضرت علامہ اقبال ان کے لیے حضرت علامہ ہی نہیں تھے بل کہ ہمہ وقت کی سرشاری تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج تک کوئی ایسا انسان نہیں ملا جسے ڈاکٹر صاحب کا کلام اس قدر حفظ ہو۔ یا اسے اس قدر برجستگی اور موزونیت سے کوٹ کر سکتا ہو۔ حضرت علامہ کے ساتھ راجا صاحب کی والہانہ عقیدت ہی نہیں تھی بل کہ عشق کیفیت تھی جس سے چھلک چھلک جاتے تھے اور بعض اوقات بھری مجلس میں ان کی کوئی چیز سوز و ترنم سے الاپنے لگتے تھے۔

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
عالم آب و خاک و باد سرِ عیاں ہے تُو کہ میں

شیخوپورہ سے لاہور یا لاہور سے شیخوپورہ کے مابین کار چل رہی ہے۔ دھیمی دھیمی رفتار کے ساتھ، پونم کے پہلے چاند کی روشنی، ایک لاہوتی سی فضا، میں ڈرائیور کے ساتھ راجا صاحب اور چودھری محمد حسین چٹھہ بیک سیٹ پر، سب خاموش، دیر تک ایک بے خودی کی سی حالت اور پھر ہلکے ہلکے سروں میں راجہ صاحب ''زمانہ'' الاپنے لگے یا ''سلسلہ روز و شب نقش گر کائنات'' آواز میں بلا کا گداز تھا۔ اور ہماری یہ کیفیت تھی کہ گویا سانپ کی طرح وجود کی کینچلیاں کہیں پھینک دی ہیں اور سراپا احساس بن کے رہ گئے ہیں۔[۵۰]

دو پروفیسر صاحبان مرزا محمد منور اور راجا عبدالقادر کے بیانات سے یہ بات

عیاں ہو جاتی ہے کہ راجا حسن اختر نہ صرف اقبالی تھے بل کہ وہ اقبال کے ہر عقیدت مند کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کلام اقبال کا وردان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ کلام اقبال کو بڑی محبت اور عقیدت سے پڑھتے تھے۔

راجا حسن اختر ۱۹۴۸ء سے مرکزیہ مجلس اقبال سے منسلک ہو گئے اور اقبالیاتی ادب کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے فکر اقبال کو ہی مشعل راہ سمجھا۔ فکر اقبالؒ کی روشنی دوسروں تک پہنچائی۔ ان کے دل اس طرح منور کر دیے کہ وہ بھی عاشقان اقبال میں شامل ہو گئے۔

وہ کلام اقبال پر عالمانہ اور استادانہ گفت گو کرتے تھے اور ایک ایک مصرع پر دفتروں کے دفتر کھولتے اور گھنٹوں گفت گو کرتا۔ کوئی بھی محفل جس میں راجا حسن اختر موجود ہوں، وہ کلام اقبال کا وظیفہ ضرور کرتے تھے۔ اس عمل کے بغیر وہ اپنی گفت گو نامکمل سمجھتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ہوتے تو انھیں اقبال کی بچوں والی نظمیں سناتے۔ کلام اقبال کی تشہیر و تبلیغ ان کی عبادت تھی۔

انھوں نے اپنی اولاد، پروفیسروں اور احباب تک کلام اقبال خوب خوب پہنچایا۔ افکار اقبال کا راجا حسن اختر کے نظریات و خیالات پر اتنا اثر ہو گیا تھا کہ وہ کلام اقبال کا وظیفہ کرتے نظر آتے تھے۔

شاید کہ کوئی ایسا ہو جو اقبال کے ضمیر کو ان سے زیادہ سمجھتا ہو۔ ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے علامہ کے شب و روز سے استفادہ کیا ہے اور ان کے کلام کی بعض خصوصیات کو خود ان کی زبان سے سمجھا ہے۔ اس لیے اقبال شناسی ان کا شعوری اور فکری اثاثہ ہے۔

حوالے

۱۔ محمداختر کیانی:میرا شہید بھائی،ص ۵۹۔

۲۔ محمداختر کیانی:میرا شہید بھائی ،راول پنڈی،مکتبہ ابلاغ،۱۹۷۱ء،ص ۵۹۔

۳۔ ایم ایس ناز،حیات اقبال،ص ۲۴۸۔۲۴۷۔

۴۔ہفت روزہ،قندیل،اپریل ۱۹۴۸ء۔

۵۔ جاوید اقبال،زندہ رود،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۸۷ء،ص ۶۱۸۔

۶۔ انقلاب ،جلد۳ نمبر۱۵،یک شنبہ،۱۶/دسمبر۱۹۲۸ءسنڈے ایڈیں۔

۷۔ محمد حمزہ فاروقی،حیات اقبال کے چند مخفی گوشے ،لاہور،ادارہ تحقیقات دانشگاہ پنجاب،۱۹۸۸ء،ص ۳۳۴۔

۸۔ ایم ایس ناز،حیات اقبال،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،س۔ن م۔ص ۱۵۶۔

۹۔ اقبال،کلیات اقبال (فارسی)،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۵ء،ص ۸۹۴/۱۲ارمغان حجاز(فارسی)،ص ۲۲۳۔

۱۰۔ عبدالمجید سالک،ذکر اقبال،

۱۱۔ میاں امیر الدین:روزنامہ نوائے وقت،منگل ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۸ء،ص ۴۳۔

۱۲۔ محمد منور،پروفیسر،میزان اقبال،لاہور،اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۲ء،ص ۱۸۔

۱۳۔عزیز ملک،پوٹھوار،اسلام آباد،لوک ورثے کا قومی ادارہ،۱۹۷۸ء،ص ۱۵۷،۱۵۶۔

۱۴۔ محموداختر کیانی،میرا شہید بھائی ،راول پنڈی،مکتبہ بلاغ،۱۹۷۱ء،ص ۱۹۔

۱۵۔ اقبال،کلیات اقبال (فارسی)،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۵ء،ص

۱۰۴/۴۹۶۔

۱۶۔ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان و بزم اقبال، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۵/۶۳۵۔

۱۷۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۰۸/۴۳۲۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۸۳/۲۸۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۶۲/۵۶۲، ۶۳/۵۶۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۹۱/۲۹۱

۲۱۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ص ۵۶۔۶۲، اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۱۹۱/۲۹۱

۲۲۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ۶۳۔۶۴

۲۳۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، ۷۸۔۷۷

باب سوم

راجہ حسن اختر کا مقام

- شعرا کی نظر میں
- جرائد کے پیش نظر
- اعزہ و احباب کی نظر میں

راجا حسن اختر کا مقام

ا۔ شعرا کی نظر میں

سید اکبر کاظمی رقم طراز ہیں:

اقبال کا شاہین

سید اکبر کاظمی نے راجا حسن اختر کے بیٹے مسعود شہید کی شہادت پر راجا حسن اختر کے حوالے سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اقبال کا ہم راز سیاست کا طرح دار
راجا حسن اختر وہ صداقت کا پرستار
وہ مردِ خدا جس کا عمل روحِ انا تھی
وہ جس کے تفکر میں ادب کی بھی ضیا تھی
وہ قوم کا ہم درد وہ ملت کا پرستار
تا زیست جو کرتا رہا اخلاص کا اظہار
تو اُس کا جگر گوشہ انوار نظر تھا
فطرت پہ تھی تیری اسی مومن کا اثر تھا ۱

حفیظ جالندھری کا کہنا ہے:

احساس

دیدہ ور ہی جانتے ہیں معنیِ مرگ و حیات
دیکھتے ہیں زندہ ہے راجا حسن اختر کی ذات

وہ حسن اختر نہ تھا، احساس تھا احسان تھا
درد مند انسان تھا معمار پاکستان تھا
یہ تو ہے خاکی لباس اُس کا نہاں اس خاک میں
ورنہ حُسنِ مردِ مومن ہے عیاں افلاک میں ؎

(ابو الاثر حفیظ جالندھری)

کرپال سنگھ بیدار کے اشعار

کرپال سنگھ بیدار تحصیل ننکانہ صاحب کے گاؤں کھنگرانوالہ کے نمبردار تھے اور پیشے کے اعتبار سے پروفیسر تھے۔ وہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد بھارت چلے گئے۔ لیکن راجا حسن اختر کو وہ اپنا محسن اور مربی سمجھتے تھے۔ اُن کی تحریر حسن آفاقی میں موجود ہے۔ یہ اشعار بھی اسی کتاب سے لیے گئے ہیں:

ھدیۂ نیاز
راجا حسن اختر کی خدمت میں

خمیرش سر معنی را عیاں کرد
نگاہش خاکداں را آسماں کرد
خوش آں اختر کہ از ضو بخشی اُو
بعالم آفتابی می تواں کرد

دلم از دوریٔ اونا صبور است
گدازم کارو بار بے سرور است
چو اختر جلوہ افروزِ نظر نیست
سجود من سجود بے حضور است

شب فروزی ہے جہاں میں مہ انور کے لیے
آب خنجر کے لیے ہے تاب گوہر کے لیے
خوئی رنگ و لطافت ہے گل تر کے لیے
حسن اخلاص ہے راجا حسن اختر کے لیے

ہاں وہ اختر کہ چمکتا ہے ستارہ جس کا
حکمت افروز ہے آنکھوں کو نظارہ جس کا

یہ وہ اختر ہے جسے گوہرخوش آب کہیں
رشک خورشید لکھیں، غیرت مہتاب کہیں
علم و حکمت میں جسے جوہر نایاب کہیں
فکر گل کار کو ایک جنت شاداب کہیں
جس کے ادراک سے روشن ہے جمال ہستی
جس کی ہستی سے نمایاں ہے کمال ہستی

کرپال سنگھ بیدار۔ ۶/۵/۴۳

ملاحظہ ہو خلیق قریشی کا ہدیۂ عقیدت

مرد مومن

اشک بار و فگار ہیں یارو حسن اختر کے غم میں دیدہ و دل
اب وہ حُسنِ کلام و رنگ بیاں کس کو ہوں گے جہان میں حاصل
رمزِ اقبال کی حسین تفسیر! ہر سخن کے معانی کامل
حسن اختر کی مرگ ناگاہ سے آج ہے سوگوار یہ محفل
یہ خبر سُن کے کہہ اُٹھا خلیق <u>مرد مومن</u> ہے <u>خلد میں داخل</u> ؎

۱۳۸۴ھ ۱۹۶۴ء

خلیق قریشی نے راجا صاحب کی تاریخ وفات بہ مطابق سنِ ہجری ۱۳۸۴ھ اور بہ مطابق سن عیسوی ۱۹۶۴ء نکالی ہے۔[۵]

لطیف انور نے راجا حسن اختر کی وفات پر اُن سے اس طرح عقیدت کا اظہار کیا!
یہ ''چٹان لاہور'' میں ۱۲۶ کتوبر ۱۹۶۴ء کو شائع ہوئی۔

مرگ حسن اختر

تو پلٹ کر کیوں نہ آیا وعدہ کر جانے کے بعد
کیوں نہ چھلکے صبر کا پیمانہ بھر جانے کے بعد
تیرے دم سے آرزو تھی انجمن آرا یہاں
دل نہ زندہ رہ سکے گا تیرے مر جانے کے بعد
کیوں بھلا ڈالا کہ مجھ سے عہد باندھا تھا کوئی
کیا دلاؤں یاد میں تجھ کو مکر جانے کے بعد
دے گیا اہل وطن کو جلوۂ عزم حیات
قبر کی تاریکیوں میں خود اُتر جانے کے بعد
حال دیکھا جائے گا مجھ سے محبت کا نہ اب
اس طرح ماضی کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد
کیا نہ لے جائے گا آگے سرگزشت درد کو
کوئی آنسو میری پلکوں پر ٹھہر جانے کے بعد
دست شفقت کو مری جانب بڑھانے سے غرض
ایک پتھر سا مرے سینے پہ دھر جانے کے بعد
تو وہاں پہنچا، یقیں آیا نہیں احساس کو
لوٹ کر آتا نہیں کوئی جدھر جانے کے بعد
اب بھی تیرے منتظر ہیں تیرے دروازے پہ لوگ
گھر سے باہر بارہا آیا تھا گھر جانے کے بعد
دست بردِ مرگ کا عالم ہے کتنا درد ناک
آرزو بگڑی ہے کوئی کیا سنور جانے کے بعد
اشک آنکھوں میں رکیں انور یہ ممکن ہی نہیں
حادثہ جانِ محبت پر گزر جانے کے بعد[۶]

حسن اختر کیانی جن کا گاؤں للیال ہے، یہ گاؤں سکھو کے قریب ہے۔ حسن اختر کیانی نے راجا حسن اختر کو خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے!

راجا حسن اختر

تھا گکھڑوں کا چیف وہ شیدائی اقبال

تاریک وادیوں میں جو حق کا سفیر تھا
چہرے پہ مسکراہٹیں دل میں غموں کا بوجھ
ہم درد خاص و عام تھا سب کا مشیر تھا
راجا تھا راج کرتا تھا لاکھوں دلوں پہ وہ
کم زور و ناتواں کا بھی وہ دست گیر تھا
مسعود اس کی عزت و عظمت بڑھا گیا
ترکش میں اس کے آخری ایسا یہ تیر تھا
اپنوں پہ مہرباں رہا غیروں کا سر پرست
اپنی نظیر آپ تھا وہ بے نظیر تھا
اک چاند تھا چمک کر اندھیروں میں چھپ گیا
جب تک رہا وہ زندہ وہ روشن ضمیر تھا

۲۔ جرائد کے پیش نظر

آنکھیں میری باقی اُن کا

چٹان، لاہور ۲۶/ اکتوبر ۱۹۶۴ء

ہم نے راجا حسن اختر کی موت پر ادارتی تعزیت میں لکھا تھا کہ یہ دن ان کے بلند و بالا ہونے کے دن تھے۔ لیکن دیکھتی آنکھوں قضا کے ترکش سے ایک تیر نکلا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سیاسیات میں آنے سے پہلے وہ بہت کچھ تھے۔ لیکن سیاسیات میں کودتے ہی ان پر نقد و نظر کی زبانیں کھلیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ سیاست کو ان کے مزاج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر جو شخص سیاسیات میں کودتا ہے وہ نہ صرف اپنے حریفوں کو ہدف تنقید بناتا ہے بل کہ خود بھی ہدف تنقید بنتا ہے۔ چناں چہ اُن پر یہی گزری۔ اقبال کے مرید ہونے کی حیثیت سے اُن کا ذاتی احترام اتنا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ رہ چکے تھے وہ ان کے لیے زبان نقد کھولنے سے

احتراز ہی کرتے تھے فی نفسہٖ وہ سیاسی زبان نہیں جانتے تھے۔ اُن کے لگے بندھے خیالات تھے جن کے تحت وہ سوچتے اور بولتے تھے۔ اُن کا انداز خود سپردگی کا انداز تھا۔ جس قائد کے ساتھ ہوتے اس طرح ہوتے کہ جیسے اُن ہی کے لیے ہیں ان کے کردار کا روشن ترین پہلو اقبالؒ سے اُن کا نظریاتی تعلق خاطر تھا۔ وہ اقبالؒ پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ اقبالؒ پر انھوں نے اپنے مطالعہ و فکر کے شب و روز صرف کیے تھے۔ اس موضوع پر دوستانہ مجلسوں میں اُن کی گل فشانی گفتار کے نے شمار پہلو نکھر نکھر کرابھرتے تھے۔

یہی تعلق خاطر تھا جو ہمارے لیے اُن کی موت سے سوہانِ روح ہو گیا۔ جوں ہی یہ خبر ملی کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہم لوگ نہ صرف دل تھام کر رہ گئے بل کہ اس فکر میں لگ گئے کہ کس طرح راول پنڈی پہنچیں۔

نوائے وقت کے ایڈیٹر مجید نظامی مشرق کے ایڈیٹر ابو صالح اصلاحی اور دوسرے کئی دوست ٹیلی فون پر ایک دوسرے سے رابطہ پیدا کر کے راول پنڈی پہنچنے کی تگ و دو میں تھے۔ چناں چہ دو تین قافلے آگے پیچھے نکل گئے۔ ایڈیٹر چٹان مجید نظامی اور ڈاکٹر مبشر حسن ٹھیک بارہ بجے لاہور سے چلے۔ ستر میل کی رفتار سے کار دوڑائی اور ساڑھے تین بجے نمازِ جنازہ کے اختتام پر پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ صبح صدر مملکت تعزیت فرما گئے ہیں۔

گورنر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ ایک دو وزیر اُس وقت بھی موجود تھے۔ چودھری افضل چیمہ بھی ایک طرف ایستادہ تھے۔ باقی ان کے اپنے عزیز و اقارب تھے، یا ذاتی دوستوں کا جمِ غفیر، بہ مشکل دو اڑھائی سو آدمی تھے۔ نماز جنازہ میں بھی اتنے ہی لوگ تھے۔ تین سو ہوں گے لیکن اخباری فیاضی نے کچھ سے کچھ بنا دیا یعنی ڈھائی ہزار تک گنتی بڑھا دی۔ رنج یہ تھا کہ جو شخص ذاتی تعلقات میں ہزاروں دوستوں کا حلقہ رکھتا تھا اور راول پنڈی کے ایک مانے تانے گھرانے کا فرزند تھا، اس

کا سفر آخرت احباب کی حاضری کے لحاظ سے اتنا مختصر رہا۔ معاً ایک بزرگ رہنما کا قول حافظہ میں جاگ اُٹھا کہ ''مسلمان صرف طاقت یا دولت کی پوجا کرتے ہیں، غریب کا ایثار رسوا ہی رہتا ہے۔ بڑا آدمی مر جائے تو اس کے جنازے میں نمائش کے لیے بڑے بڑے چہرے شریک ہو جاتے ہیں۔ غریب خواہ حسرت موہانی ہی کیوں نہ ہو اس کے جنازے میں صرف اہل دل ہی شریک ہوتے ہیں۔ اہل دولت کے ہاں اُن کے لیے گھڑی گھڑائی معذرتیں تیار ہوتی ہیں۔

راجا صاحب کا جنازہ ایک ٹرک میں رکھ کر اُن کے آبائی گاؤں کہوٹہ لے جایا جا رہا تھا۔ احتراماً ٹرک کے آگے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی لہرا دیا گیا۔ مگر ٹرک کے ہم راہ صرف دو کاریں تھیں ایک گوجرانوالہ کے دوستوں کی ایک لاہور کے۔ غور کیجیے ان دو کاروں میں بھی اُن کی مسلم لیگ کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ اُن کے ذاتی دوست تھے۔ راول پنڈی الہڑ دوشیزہ کی طرح ہنس کھیل رہا تھا۔ مسلم لیگ کا ایک بھی ممتاز و منفرد شخص موجود نہ تھا۔ الا سید اصغر علی شاہ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس شہر کو خبر نہیں کہ مسلم لیگ مغربی پاکستان کے صدر کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا ہے۔ اخباروں میں جو کچھ آیا۔ جن لوگوں نے بیانات دیے وہ سب رسمی تھے۔ بات چبھتی ہوئی ہے لیکن عرض کیے بغیر چارہ نہیں کہ وہ راجا صاحب کہ کفنانے یا دفنانے سے زیادہ اس فکر میں تھے کہ پیا سہاگن کسے کرتے ہیں یعنی مغربی پاکستان مسلم لیگ کنونشن کا تاج کس کو پہنایا جاتا ہے یا سہرا کس کے سر باندھا جاتا ہے۔

یہ ہے ایک غریب اور مخلص کارکن کی موت

۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کے چٹان لاہور نے یہ آرٹیکل شائع کیا۔

راجا حسن اختر

بیش تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قریب آتے ہی اپنی کشش کھو دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کی قربت سے ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ جس حسن اختر کو میں

نے سنا تھا ایک زحمت تھا۔ لیکن جس حسن اختر کو میں دیکھا ہے وہ ایک رحمت ہے۔

بونا قد، کھلتا ہوا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، کشادہ پیشانی، دوستوں کا دوست بل کہ جگری دوست بل کہ یوں کہیے کہ دوستی کی مثال تصویر۔ بڑے باپ کا بڑا بیٹا، شرافت گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

ظاہر و باطن میں اقبال کا مردِ قلندر، حکیم الامت کو اپنا پیر مانتا اور ان کے نام پر سر جھکا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے اس وقت پاکستان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو کلام اقبال کے ضمیر کو اس سے زیادہ سمجھتا ہو۔ اس کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے علامہ کے شب و روز سے استفادہ کیا ہے اور ان کے کلام کی بعض خصوصیتوں کو خود ان کی زبان سے سمجھا ہے۔

خود گکھڑ قبیلے کا چشم و چراغ ہے۔ خاندان کے لوگ شروع ہی سے فوج میں ملازم ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن حسن اختر ان سب سے الگ تھلگ چراغ اپنا جلا رہا ہے۔

حسن اختر نے اپنے دوستوں سے بے شمار زخم کھائے ہیں اور شاید ابھی تک وہ زخم کھانے کے لیے زندہ ہے۔

بے حد حساس، بے حد مخلص، بے حد وفادار، سراپا ایثار اور سراپا قربانی، لہجہ میں ملائمت، طبیعت کبھی قطرۂ شبنم اور کبھی فوارۂ شمشیر، گھر پھونک کر تماشہ دیکھنے والے۔

بہ درجہ آخر۔ جذباتی، کبھی کسی دوست کی غیبت نہیں کرتا اور نہ کبھی سنتا ہے۔ اس کی زندگی نصب العین ہے۔

یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر
اور حسن اختر جو کچھ ہے یہی ہے[۵]

روزنامہ تعمیر راولپنڈی نے اپنے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو یہ مقالہ شائع کیا:

پوٹھوہار کے نامور فرزند!

راجا حسن اختر کی یاد میں

آج پاکستان کے مشہور محب الوطن اور پوٹھوہار کے نامور فرزند راجا حسن اختر کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ راجا صاحب کا ان دنوں انتقال ہوا جب پاکستان میں نئے آئین کے تحت صدارتی انتخابات کی بڑی گہما گہمی تھی۔ راجا صاحب مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہونے کی حیثیت سے صدارتی انتخابات میں بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔

آپ صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ انتخابی سرگرمیوں کے آغاز ہی میں وہ اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی اچانک موت سے خصوصیت سے ان سینکڑوں اشخاص نے اپنا ذاتی نقصان محسوس کیا جن کے کام راجا صاحب ہر حال میں آتے رہے ہیں۔

صدر کا انتخاب ہو گیا۔ ملک میں انتخابی سرگرمیوں کے بعد سکون پیدا ہوا اور حکومت ملک کی ترقی کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن ابھی سال ہی ختم نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی ایک نئی تاریخ کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے بزدلانہ اور وحشیانہ حملے سے پاکستان ایک آدمی کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ دشمن کے تمام منصوبے اور عزائم خاک میں ملا دیے گئے۔

پاکستان کی تاریخ کا یہ نیا باب جس کا پاکستانی قوم نے اپنے خون سے آغاز کیا ہے، اس میں راجا حسن اختر کے فرزند میجر مسعود کا بھی خون ہے۔ جنھوں نے شجاعت اور دلیری کا ایک نیا معیار قائم کرتے ہوئے سیال کوٹ محاذ پر جام شہادت نوش کیا۔ اگر راجا صاحب زندہ ہوتے وہ اپنے بیٹے کی شہادت پر فخر کرتے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک بھی زندگی کی معراج مرتبہ شہادت تھا۔

راجا حسن اختر ۱۹۰۴ء میں کہوٹہ کے گکھڑ خاندان کے ممتاز گھرانے میں پیدا

ہوئے تھے۔ان کے والد راجا کرم داد خان گکھڑ قبیلہ کے سردار تھے۔راجا حسن اختر پوٹھوہار کے آخری حکمران سلطان مقرب خان کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔جنھوں نے سکھوں کے خلاف ہمیشہ علم جہاد بلند رکھا۔اس کے بعد اس جنگ جو خاندان کے حالات خاصے خراب رہے کیوں کہ راجا حسن اختر کے والد کرم داد خان نے انگریزوں کی اطاعت قبول نہ کی اور آزادی کے لیے لڑتے رہے۔راجا صاحب نے تحریک خلافت میں حصہ لیا۔یہی وجہ تھی کہ انگریز اس خاندان سے خوش نہیں تھے۔

راجا حسن اختر نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں صوبائی سول سروس کا امتحان دیا اور کامیاب ہوگئے۔تعلیم کے زمانے ہی انھیں مفکر پاکستان علامہ اقبال کی رفاقت نصیب ہوگئی، چناں چہ ان کے نظریات اور خیالات پر علامہ اقبال کا کافی اثر تھا۔علامہ اقبال کی وفات تک راجا حسن اختر کو ان کا قرب حاصل رہا۔بل کہ علامہ اقبال نے یہ مشہور رباعی جو انھوں نے اپنی وفات کے وقت پڑھی، راجا صاحب ہی کو سنائی تھی!

سُرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دِگر دانائے راز آید کہ ناید؟[۹۹]

یہ رباعی سنانے کے بعد علامہ اقبال کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

راجا حسن اختر مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور اس دوران بھی تحریک پاکستان کے لیے کام کرتے رہے قیام پاکستان کے بعد وہ مختلف اضلاع کے ڈپٹی کمشنر رہے۔اس وقت مغربی پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی تھے جن سے راجا صاحب کی نہ بنی اور انھیں ۱۹۴۸ء میں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ملازمت چھوڑنے کے بعد راجا صاحب نے قانون کا امتحان پاس کیا اور پریکٹس شروع کردی جو بڑی کامیاب

رہی۔

راجا حسن اختر ایک معروف ادبی شخصیت اور علامہ اقبال کے پیرو تھے۔ انہیں علامہ اقبال سے بڑی محبت اور عقیدت تھی اور پاکستان کو ترقی یافتہ اور خوش حال دیکھنا چاہتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے راول پنڈی سے قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد پاکستان مسلم لیگ قائم ہوئی تو راجا صاحب کو اس کا نائب صدر منتخب کیا گیا اور پھر اتفاق رائے سے مغربی پاکستان مسلم لیگ (کنونشن) کے صدر منتخب ہوئے۔ انھوں نے صوبے میں مسلم لیگ کی تنظیم کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ وہ نہ صرف اپنے حلقہ انتخاب کے لوگوں بل کہ صوبے کے بے شمار لوگوں کے کام آتے تھے۔

راجا صاحب اپنے دور کی ایک منفرد شخصیت تھے۔ آپ ان افراد میں شمار کیے جا سکتے ہیں جنھوں نے قیام اور استحکام پاکستان کے لیے انتھک محنت اور کوشش کی۔ وہ صرف سیاسی حلقوں میں نہیں بل کہ ملک کے ادبی حلقوں میں بھی معروف تھے۔ علامہ اقبال کے کلام اور ان کی زندگی کے بارے میں راجہ صاحب ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔

روزنامہ تعمیر راول پنڈی نے ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۵ء کو جو مقالہ شائع کیا ہے اس میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ علامہ اقبال کی رفاقت تک راجا حسن اختر کو اُن کا قرب حاصل رہا، دراصل رفاقت کی بجائے وفات ہونا چاہیے ۔۔۔۔ آگے چل کر اخبار لکھتا ہے کہ حضرت علامہ نے جو رباعی وفات کے وقت کہی وہ راجہ حسن اختر کو ہی سنائی۔ یہ رباعی حضرت علامہ نے پہلے کہی اور مرنے سے دس منٹ پہلے یا پندرہ منٹ پہلے راجا صاحب کو سنائی۔ راجا صاحب یہ رباعی سُن کر حکیم قرشی کو بلانے چلے گئے اور اس کے پندرہ منٹ بعد حضرت علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔ عاشق حسین بٹالوی نے مئی ۱۹۳۸ء میں ادبی دنیا کے لیے ایک مضمون لکھا۔ اُس میں وہ لکھتے ہیں

کہ وفات سے پندرہ منٹ پہلے علامہ نے یہ رباعی راجا صاحب کو سنائی۔ تعمیر نے مزید لکھا ہے کہ یہ رباعی سنانے کے بعد علامہ اقبال کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ درحقیقت پندرہ منٹ بعد ان کا انتقال ہوا۔ راجا صاحب کے فرزند کرنل ظہور اختر کا کہنا ہے کہ راجا صاحب جب گاڑی کے پاس پہنچے کہ حکیم قرشی کا بلا لائیں تو علی بخش نے پیچھے سے آواز دی اور راجہ صاحب واپس آ گئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ خود اس وقت حضرت علامہ کے ہاں موجود تھے۔

۳۔اعزّہ و احباب کی نظر میں

راجا محمد زر ساکن شندوٹ نے بتایا ؂۱

راجا حسن اختر میرے محسن تھے۔ مجھے ان کے ساتھ سفر اور نشست و برخاست کے بہت سے واقع ملے۔ وہ ایک بڑے آدمی تھے لیکن طبعاً درویش، ملنسار اور مخلص انسان تھے۔ اُن کے سینے میں انسانیت کا درد تھا۔ میں ایک دو ملاقاتوں میں ہی اُن سے بہت متاثر ہو گیا۔

راجا حسن اختر کے والد گکھڑوں میں ایک باعزت مقام رکھتے تھے۔ اُن کے انگریزوں سے تعلقات ٹھیک نہ رہے۔ انگریز چاہتے تھے کہ ان گکھڑوں کو ساتھ ملا لیا جائے۔ انگریزی حکومت نے تحصیل دار سردار محمد اعظم کو گکھڑوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے کہا۔ تحصیل دار نے راجا حسن اختر کے والد راجا کرم داد سے رابطہ قائم کیا۔ اور گورنر کو کہوٹہ راجا کرم داد کے ہاں آنے کے لیے کہا گیا۔ گورنر نارمن ہیلی بذریعہ ریل سہالہ ریلوے سٹیشن تک آیا۔ سہالہ میں گکھڑوں اور ان کے رفقاء نے گھوڑوں کا ایک عظیم الشان جلوس تیار کیا ہوا تھا۔ جو اسے لے کر کہوٹہ پہنچا۔ اسی موقع پر گورنر نے راجا حسن اختر کو بطور افسر مال بھرتی کر لیا۔ راجا صاحب گریجوایشن کر چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۶ء کا ہے۔

راجا صاحب جس محفل میں ہوتے اُس محفل کی جان ہوتے۔ وہ محفل کو

گرمانے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ خود بھی محفل سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے بے تکلفانہ انداز سے گفتگو کرتے، مذاق کرتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ وہ دوستوں اور عام لوگوں میں بے حد مقبول تھے۔ حاجب مندوں اور دوستوں کا ایک جم گھٹا اُن کے گرد رہتا تھا۔ نجی محفل میں وہ شمع محفل کی طرح چمک رہے ہوتے تھے۔ میں نے بعض بزرگوں کو اُن کی محفل میں دیکھا کے مالک تھے۔ حسن اختر روز روز پیدا نہیں ہوا کرتے۔ مسلم لیگ کے لیے اُن کے ہر فیصلے کا احترام کیا جاتا تھا۔ وہ جنون کی حد تک مسلم لیگ اور تحریک پاکستان سے وابستہ رہے۔ تمام مسلم لیگی اُن کی خدمات کے معترف تھے اور اُن کا احترام کرتے تھے۔

راجا حسن اختر نے صدارتی انتخابات میں صدر ایوب خان کی مدد کرنے کے لیے دن رات ایک کیا۔ سخت گرمی کا موسم اور رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ میں اکثر راجا صاحب کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ گاڑی میں بھی ہمیشہ اقبال کی تصانیف اور قرآن کریم ضرور رکھتے تھے۔ وہ مولانا روم کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ قرآن کریم کی تعلیمات اور مولانا روم اور علامہ اقبالؒ کے ارشادات سے زندگی کے سفر کے لیے روشنیاں حاصل کرتے تھے۔

وہ جو کام بھی کسی کے لیے کرتے تھے اُس میں کوئی لالچ نہیں رکھتے تھے۔ وہ کبھی احسان بھی نہیں جتاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے بیٹا! تعلق بناؤ تو خلوص کے ساتھ۔ ایسے تعلقات دیرپا بھی ہوتے ہیں اور اس طرح قائم ہونے والی دوستی قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔ لوگ اُن کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور صوفیاء کے ارشادات سے مستفید ہوتے تھے۔

راجا صاحب علامہ کے پاس حاضری دینے کو ہمیشہ اعزاز سمجھتے رہے۔ میرے اُن کے ساتھ تعلقات ۵۰۔۱۹۴۹ء میں قائم ہوئے۔ میں نے اُن کی دیانت داری، انسان دوستی اور درویشی کے قصے تو پہلے ہی سے سن رکھے تھے۔ جب اُن سے میری

پہلی ہی ملاقات ہوئی تو میں ان کے حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوا اور ان کا گرویدہ ہوگیا۔ وہ اقبالی تھے۔ ان کو علامہ اقبالؒ کی محفلوں میں اکثر حاضر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ راجا سید اکبر گوڑھ والے جب بھی راجا صاحب کے پاس آتے تو خصوصی محفل جمتی اور بہت قیمتی باتیں ہوتیں۔ بے تکلفی کی باتیں ہوتیں، ہنسی مذاق چلتا اور کلامِ اقبالؒ ایک دوسرے کو سنایا جاتا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اقبال کا ایک شیدائی اور سچا طالب علم میرے ساتھ رہا لیکن میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

جب اُن کی ملازمت اچانک ختم ہوگئی تو مالی حالات اچھے نہ رہے۔ یہ اُن کی دیانت داری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اپنے مالی حالات کو بہتر بنانے کے لیے انھوں نے لاء کرنے کا فیصلہ کیا اور لاء کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ انھوں نے سنجیدگی سے ایک طالب علم کی طرح پڑھا۔

لباس کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ ہمیشہ اچھا لباس زیب تن کرتے تھے۔ وہ اپنے درزی کو ہمیشہ فیشن کے حوالے سے خاص خاص ہدایات دیا کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی اچھا لباس پہننے کو کہتے۔ وہ لباس اچھا پہنتے تھے لیکن مغرور اور خودسر نہیں تھے۔ جتنا صاف ستھرا اُن کا لباس ہوتا تھا اتنے ہی وہ اندر سے بھی صاف تھے۔ اُن میں عہدے یا خاندان کا کوئی تکبر موجود نہیں تھا۔

م ش، شورش کاشمیری اور حمید نظامی سے تعلقات

م ش شورش کاشمیری اور حمید نظامی سے اُن کے خاص تعلقات تھے۔ یہ حضرات اُن کے بے تکلف دوست تھے۔ ان کے ساتھ راجا صاحب کی نجی محفلیں جمتیں اور بہت مزے کی باتیں سننے کو ملتیں۔ میں نے شورش کاشمیری اور حمید نظامی کو راجا صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا لیکن م ش سے ملاقات نہ ہوسکی ان کا ذکر راجا صاحب بہ حیثیت دوست کرتے رہتے تھے۔ مال روڈ لاہور پر ایک کیفے میں حمید نظامی، شورش کاشمیری اور راجا صاحب بیٹھا کرتے۔ راجا حسن اختر اور خواجہ

عبدالرحیم نوائے وقت کے بانیوں میں سے تھے۔حمید نظامی کے ساتھ ان کی ملاقاتیں اور محفلیں مجھے آج بھی یاد ہیں، اُن سے اُن کے قریبی مراسم تھے۔ راجا حسن اختر نے جب وکالت شروع کی تو ان کے دفتر کے نیچے ساتھ ہی شورش کاشمیری کی رہائش تھی۔ راجا صاحب کا دفتر نرسنگھ داس بلڈنگ کی دوسری منزل پر تھا اور اسی عمارت کی پچھلی جانب شورش کاشمیری کا دفتر تھا۔شورش راجا صاحب سے کوئی کام کہتے تو وہ بڑی محبت سے ان کا کام کرتے تھے۔حمید نظامی اور شورش قدآور شخصیات تھیں لیکن وہ راجا صاحب کا احترام کرتے تھے۔م ش کے متعلق تو میں نے دوسروں سے سنا کہ وہ راجا صاحب کے عاشق تھے۔یہ سب لوگ قیام پاکستان سے پہلے راجا صاحب کے دوست تھے۔شورش کاشمیری قیام پاکستان کے بعد اُن کے دوست ہوئے۔

راجا صاحب کی طبیعت میں کافی حد تک ظرافت تھی۔وہ ایک مصروف انسان تھے۔ دوستوں کی محفلیں اُن کے لیے غنیمت تھیں۔وہ دوستوں سے کھل کر بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے اور اپنی تھکان دور کرتے۔میں نے اُن کی محفلوں میں مرزا اللہ دتہ اور مرزا محمد صادق کو قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا۔ان سے راجا حسن اختر کی بے تکلفی تھی۔[۱۴۲] مرزا اللہ دتہ اور مرزا محمد صادق کا تعلق گاؤں کینٹ خلیل سے تھا جو تحصیل گوجر خان کا ایک مشہور اور بڑا گاؤں ہے۔[۱۴۳]

چودھری علی اصغر ٹیچر ریٹائرڈ ساکن چھپر آراضی (رواٹ کلر روڈ) تحصیل کہوٹہ کا بیان

قربت کا سبب: میں سیاست میں حصہ لیتا تھا اور راجا صاحب کے مخالفین میں سے تھا۔ایک دفعہ کہوٹہ سے آگے بٹالہ کے مقام پر جلسہ ہو رہا تھا۔راجا صاحب کی صدارت تھی۔ میں نے بھی جلسہ میں تقریر کرنے کی اجازت لے لی۔ میں نے دھواں دھار تقریر کی اور راجا صاحب کی مخالفت میں بولتا چلا گیا۔میں بار بار اُن کے

چہرے کی طرف دیکھتا تھا اور مجھے اُن کے چہرے پر ایک اطمینان اور مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ میرے گرم جذبات اُن کے ٹھنڈے مزاج سے شکست کھاتے جا رہے تھے۔ میں اُن کی قوتِ برداشت پر حیران ہو رہا تھا۔ جب یہ تقریب ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے اپنے پاس بلوایا، کہنے لگے! ''دیکھو یار! تم نے کچھ باتیں تو خواہ مخواہ مجھ سے منسوب کر دی ہیں میرا اُن سے کوئی تعلق نہیں۔ بہ ہر حال مجھے اعتراف ہے کہ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔ میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم نے میری خامیوں کی نشان دہی کی اور مجھے احساس دلایا۔ میں انشاءاللہ ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں حیران تھا کہ میں نے جس شخص کی سرِ عام مخالفت کی ہے وہ کتنی محبت اور شفقت سے مخاطب ہے اور شکریہ ادا کر رہا ہے۔ میری نگاہیں جھک سی گئیں اور میں ان کی عظمت کا قائل ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے اُن کا عقیدت مند بن گیا۔ ایک مرتبہ ایک جج کے پاس ایک آدمی کی سفارش کے لیے گئے جو پہلی جماعت میں اُن کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ اُس شخص نے عام سے کپڑے پہن رکھے تھے اور خالص دیہاتی لگ رہا تھا۔ راجا صاحب نے کہا! ''جج صاحب یہ میرا بھائی ہے اس کا کام ضرور کرنا ہے''۔ جج صاحب نے اُس آدمی کو سر تا پا دیکھا اور حیرانی سے پوچھا! راجا صاحب، یہ آپ کا بھائی ہے''۔ جواب دیا ''ہاں ہاں میرا بھائی ہے'' ۔جج نے اُس آدمی کا کام کر دیا۔

وہ ہر آدمی کو اہمیت دیتے تھے۔ اپنے بیٹوں سے ہمیشہ کہا کرتے تھے! ''ان لوگوں کی قدر کیا کرو یہ بہت اچھے لوگ ہیں''۔ اُن کے ذہن میں اونچ نیچ اور ذات پات کی کوئی بات نہیں تھی۔

میں خود ان کا مخالف تھا جسے ان کے کردار کی عظمت نے گرویدہ بنالیا تھا۔ اُن کے مخالف محض مخالفت بہ رائے مخالفت کا رویہ اختیار کرتے تھے لیکن اُن کی بات کچھ اور تھی۔ وہ اپنے مخالفین کو بھی بُری نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اگر کوئی مخالف کوئی

غرض لے کر ان کی محفل میں آ جاتا تو وہ اُٹھ کر ملتے تھے اور کبھی ہتک آمیز رویہ نہیں اختیار کرتے تھے۔ اس طرح مخالفین بھی اُن کے حسنِ سلوک سے اُن کی محبت کے اسیر ہو جاتے تھے۔ ملنے والا یہ تاثر لے کر نہیں جاتا تھا کہ وہ کسی بڑے افسر، بڑے آدمی یا معزز آدمی سے مل کر آیا ہے۔ لوگ اُن کی درویشی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

راجا صاحب کے عروج سے پہلے گکھڑوں اور راجپوتوں کے مخالفت چلی آتی تھی۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں لیکن جب راجا حسن اختر سامنے آئے تو انھوں نے ذات پات کی تفریق اور فرقہ بندی کو مسترد کر دیا۔ وہ گکھڑوں اور راجپوتوں کے اختلافات دور کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

چودھری علی اصغر کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص محمد امین نے بتایا! ''میں لاہور ان کے پاس ایک مقدمے کے سلسلے میں گیا۔ وہ اس وقت وکیل تھے۔ انھوں نے مقدمہ لے لیا اور فیس کی کوئی بات نہیں کی۔ مقدمہ جب ختم ہو گیا تو ہم نے سوچا کہ اب راجا صاحب کو فیس دے دی جائے۔ فیس کی بات کی تو کہنے لگے! ''تم فیس کو چھوڑو، صرف اتنا کرو کہ کہوٹہ والے حضرت سخی سبزواری کا شجرہ نسب چھبر سیّداں والے حضرت بابا فیض اللہ شاہ صاحب سے معلوم کرو کیوں کہ تم ان کے مرید ہو اور وہ سخی سبزواری کے متعلق جانتے ہیں۔''

پھر کہا راجا صاحب پکے اقبالی تھے۔ مجھے اب صحیح تو یاد نہیں لیکن خیال ہے کہ راول پنڈی میں ایک وکیل کے گھر بیٹھے ہوئے تھے میں بھی وہاں چلا گیا۔ اقبال کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی۔ راجا صاحب اقبالؒ کے شعر اسنا رہے تھے۔ فرمائش پر انھوں نے اس شعر کی تشریح کی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے[14]

یہ شعر زباں زدعام ہے لیکن انھوں نے نہایت موثر انداز میں تشریح کی۔ وہ ایک ذہین آدمی تھے۔ گفتگو کا سلیقہ انھیں آتا تھا۔ محفل میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بل کہ اپنی گفتگو سے محفل گرماتے تھے۔ وہ اہل علم کی قدر کرتے تھے۔ نجی محفلوں میں وہ اپنی ظرافت اور شگفتہ گفتگو سے لوگوں کو متاثر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔

راجا حسن اختر کے داماد مرزا مغفور احمد کے تاثرات[15]

گھر میں راجا صاحب کبھی کسی بچے یا نوکر کو برا بھلا نہیں کہتے تھے۔ مقبول عوام ایسے تھے کہ عموماً بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتے۔ وجہ یہ تھی کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے پاس جانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔

راجا صاحب ایک نہایت دیانت دار آدمی تھے۔ وہ رشوت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ وہ رشوت خوروں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ رزق حلال پر اُن کا مکمل ایمان تھا۔ بہ حیثیت داماد مجھے اُن پر فخر تھا اور آج بھی ہے۔ مجھے جب کبھی پیسے کی ضرورت ہوتی تھی میں ان سے مانگ لیتا تھا اور کبھی اُن کی جیب سے نکال لیتا تھا۔ اُن کی جیب سے پیسے نکالتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے باپ کی جیب سے نکال رہا ہوں۔ اُدھر ان کی شفقت ہوتی تھی ادھر میرا دعویٰ ہوتا تھا۔ اور اس میں بہت مزہ تھا۔ بعض اوقات اُن کے بیٹے اور میرے برادر نسبتی محمود نے بھی میرے سامنے اُن کی جیب سے پیسے نکال لیے لیکن اُن کی جانب سے ناراضگی کا کوئی اظہار نہیں ہوا۔

گولڑہ والے سجادہ نشین بابو جی سے راجا صاحب کو بہت محبت تھی۔ وہ خود راجا صاحب سے کہتے! ''پیر صاحب آپ مصروف آدمی ہیں۔ آپ تکلیف نہ کیا کریں۔ میں آپ کے پاس آ کر آپ سے مل لیا کروں گا''۔

پیر صاحب فرماتے! ''راجا صاحب آپ مصروف آدمی ہیں، آپ کو وقت کہاں ملتا ہے۔آپ کا وقت بہت قیمتی ہے آپ لوگوں کے کام کرتے ہیں اس لیے میں نہیں چاہتا کہ آپ کا وقت ضائع ہو۔آپ سے ملاقات کو جی چاہتا ہے تو میں چلا آتا ہوں۔آپ سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔آپ خلقِ خدا کے کام آتے ہیں اور یہ اللہ کریم کو بہت پسند ہے۔آپ اپنا وقت ہرگز ضائع نہ کریں۔

ایک بار میں راجا صاحب کے ساتھ ایک جج صاحب سے ملنے گیا۔ہم متعلقہ سول جج کے گھر پہنچے، جج صاحب اُسی وقت عدالت سے گھر آئے تھے اور آرام کر رہے تھے۔ہم نے گاڑی روکی تو جج صاحب کا نوکر ہمارے قریب آیا۔راجا صاحب بولے! ''جاؤ جج صاحب سے کہو راجا حسن اختر آیا ہے۔'' اس نے جواب دیا! ''صاحب آرام کر رہے ہیں، مجھے جرأت نہیں ہے کہ میں انھیں جگاؤں''۔انھوں نے کہا! ''تم جاؤ اور صرف اتنا کہہ دو کہ راجا حسن اختر آیا ہے۔پھر اگر ناراض ہوئے تو میں راضی کر لوں گا۔'' یہ باتیں جج صاحب نے سُن لیں اور راجا حسن کی آواز کانوں میں پڑی۔وہ تہ بند پہنے اور پاؤں میں سلیپر ڈالے اُسی طرح دوڑتے ہوئے باہر آ گئے۔وہ راجا صاحب کو دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئے اور گلے ملے۔پھر وہ نوکر سے خفا ہوئے۔راجا صاحب کہنے لگے! ''جج صاحب آپ ناراض نہ ہوں اُس نے اپنا فرض پورا کیا ہے اور یہ اس کی نوکری ہے۔'' پھر ہم اندر چلے گئے۔جج صاحب کہنے لگے! ''راجا صاحب میں تو آپ کو آسمانوں پر ڈھونڈتا تھا۔آپ مجھے زمین پر مل گئے اور میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لے آئے۔'' کہنے لگے! ''میرے لائق کوئی کام؟''۔''جی ہاں! میری خواہش تھی کہ ایک ایسی نشست ہو جائے جس میں علامہ اقبال کی یاد تازہ کی جائے۔آپ سے کچھ سُنا جائے اور سنایا جائے۔'' پھر کیا تھا محفلِ اقبال جم گئی اور ڈھائی تین گھنٹے تک یہ محفل اقبال کی خوشبوؤں سے معطر ہوتی رہی۔ہم لوگ بھی یہ خوب صورت

باتیں اور شعر سنتے رہے۔ ہم اس طویل نشست میں تھک بھی گئے لیکن ہم میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ مداخلت کرے۔ یہ بڑی پروقار اور پُر لطف محفل تھی۔

لوگ انھیں پیر انگلی شاہ اور راجا لائسنسی کہا کرتے تھے۔ پیر انگلی شاہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ جو اُن کی انگلی پکڑ کر کام کے لیے کہتا تھا وہ اُٹھ کر چل پڑتے تھے۔ [۵۹] اور راجا لائسنسی بھی لوگ اس لیے کہتے کہ انھوں نے ہر کسی کا کام کرنے کا لائسنس لے رکھا تھا۔

وہ خوش لباس ہونے کے ساتھ ساتھ خوش خوراک بھی تھے اور خوش شکل بھی۔ وہ اکثر اوقات اکٹھا کپڑا لے آتے اور اپنے عزیزوں میں ان کی پسند کے مطابق تقسیم کر دیتے۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ دوسرے لوگوں پر بے پناہ خرچ کرتے تھے۔ ان کی آمدنی کے ذرائع ملازمت اور اس کے بعد وکالت کے علاوہ دس مربع زمین تھی۔ لیکن وہ جمع کرنے کی فکر میں نہیں ہوتے تھے۔ علاقہ کے لوگ لاہور مقدمات کے لیے جاتے تھے اور ان میں سے جو بھی غریب ہوتا وہ اس کا مقدمہ مفت لڑتے تھے۔

وہ دوسروں کے لیے بہت کچھ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی افسری یا وکالت کے وسیلے سے کچھ نہیں بنایا۔ انھوں نے کبھی کسی بیٹے یا بیٹی کے لیے کوئی جائداد یا مکان ناجائز طور پر نہیں بنایا۔ سب کچھ انھیں اپنی جیب یا جائداد سے دیا۔ وہ خود صاحب جائداد تھے۔ انھوں نے کسی داماد کو بھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں پہنچایا۔

میں نے ایک بار اُن سے کہا! آپ ایم این اے ہیں آپ سر صوبہ شاہ کے مقام پر ہائی سکول بنا دیں۔ جواب دیا! ”اگر میں نے دوسروں کو نظر انداز کر دیا اور تمھارے علاقہ میں ہائی سکول بنا دیا تو لوگ کہیں گے رجا اپنوں کو نواز رہا ہے اور دوسروں کی پروا نہیں ہے۔“ انھوں نے اس وقت دو ہائی سکول بنوائے۔ ایک نارہ

میں دوسرا چنگا میرا میں کہنے لگے! ''سرصوبہ شاہ میں سکول کا معاملہ بعد میں دیکھیں گے۔''

صدر ایوب خان نے قریب کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے ایک شرط رکھی۔ ''میں کسی ایسی جماعت یا پارٹی میں شامل نہیں ہو سکتا جس میں مسلم لیگ کا نام نہ آئے''۔

صدر ایوب خان نے کنونشن مسلم لیگ بنائی راجا صاحب کو اس کے سیاہ سفید کا مالک بنا دیا۔ انھیں مغربی پاکستان مسلم لیگ کا صدر بنا دیا گیا۔

شوق مطالعہ: ان کو ساری زندگی مطالعہ کا شوق رہا۔ وہ فارغ اوقات میں مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ وہ رات کو سونے سے پہلے عموماً مطالعہ کرتے تھے۔ سفر میں بعض اوقات جب وہ گاڑی خود نہیں چلا رہے ہوتے تھے اس وقت گاڑی میں بھی مطالعہ کر لیتے تھے۔ اُن کی معلومات وسیع تھیں۔ ان کی اپنی ذاتی بہت بڑی لائبریری تھی۔ اس لائبریری میں زیادہ تر مذہبی اور ادبی قسم کی کتابیں تھیں۔ وہ بہت بڑے اقبالی تھے اور ان کی لائبریری میں علامہ اقبال کے متعلق بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ وہ اقبال کے علاوہ مولانا روم، غالب اور دوسرے شعراء کو بھی پڑھتے تھے۔ کتابوں سے انھیں بہت پیار تھا۔ اگر کوئی کتاب ضائع کرتا یا لے جانے کی کوشش کرتا تو وہ بہت محسوس کرتے تھے۔ اُن کی لائبریری اب کئی جگہوں پر تقسیم ہو چکی ہے اور یہ کتابیں اب ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔

مصروفیات میں وہ بعض اوقات اہم باتیں بھی بھول جاتے تھے۔ ایک بار انھوں نے جہلم کے ڈی ایف او محمد حسین چیمہ کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانا لگ گیا۔ پلیٹیں اُلٹی پڑی تھیں۔ اور بھی لوگ دعوت میں موجود تھے۔ راجا صاحب نے ڈش سے چاول لیے اور اُلٹی پلیٹ پر ڈال دیے۔ چیمہ صاحب اُٹھے اور اُنھوں نے پلیٹ سیدھی کر دی۔ یہ ان کی روز و شب کی مصروفیات کا اثر تھا۔

حسن مبرور سینئر سول جج اسلام آباد نبیرہ راجا حسن اختر فرزند مرزا مغفور احمد کی باتیں

ہمارے نانا بہت شفیق اور محسن تھے۔ انھیں ابا جی کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بہت ہی مصروف آدمی تھے اس لیے تھک جاتے تھے۔ جب گھر آتے تو ہمیں آواز دیتے اور کہتے! ''بیٹا میں بہت تھک گیا ہوں''۔ ہم اُن کا جسم دبانے لگتے۔ وہ بہت خوش ہوتے۔ اُن کے پوتے پوتیاں بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جاتی تھیں۔ جب ہم یہ فریضہ انجام دے دیتے تو وہ پیار کرتے اور ہمیں انعام دیتے تھے۔ وہ بہت ہی شفیق تھے اور ہماری تمام ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ جب زمانہ طالب علمی میں ہمیں کوئی سائیکل، پسند کا کھلونا یا سوٹ خریدنا ہوتا تو ہم اپنے ابو کی بجائے اُن سے فرمائش کرتے تو وہ فوراً ہماری فرمائش پوری کرتے۔ اگر مصروفیت کی وجہ سے فرمائش پوری نہ کر سکتے تو گھر آ کر معذرت کرتے تھے اور بڑی شفقت سے فرماتے! ''بیٹا آج میں بہت مصروف رہا ہوں اور تمھاری فرمائش پوری نہیں کر سکا۔ فکر مت کرنا تمھاری فرمائش ضرور پوری ہوگی''۔ ہم اُن کے پاس ٹھہرتے تو وہ ہمیں کلام اقبالؒ سناتے رہتے اور یاد کرنے کی ہدایت فرماتے۔ بچوں میں سے جو بھی علامہ اقبالؒ کے شعر سناتا وہ اُسے انعام دیتے، پیار کرتے اور خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں عام طور پر انعام حاصل کرنے کے لیے علامہ کی مشہور نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' سنایا کرتا تھا۔ ہم ایک بار اُن کے ساتھ لاہور گئے۔ میری خالہ کی شادی تھی۔ پورے سفر میں ہمیں اقبالؒ کے شعر سناتے رہے۔ گجرات تک گاڑی خود چلائی۔ وہاں پہنچ کر ڈرائیور کو دے دی۔ پھر وہ آزادی سے کلام اقبا سنانے لگے اور لاہور تک سفر کا یہی رنگ رہا۔ وہ کلام اقبالؒ کے شیدائی تھے۔ کسی بچے سے کلام اقبالؒ سنتے تو بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ وہ ہمیں شعر سنا کر ان کی تشریح سادہ الفاظ میں کرتے تاکہ ہم سمجھ سکیں۔ اس وقت ہم بچے تھے لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ وہ کلام اقبالؒ کی تبلیغ کرتے تھے۔ مجھے اُن سے یہ بھی پتا چلا تھا اُن کی والدہ کو بھی اقبالؒ کے

اردو اور فارسی کے شعر یاد تھے کیونکہ راجا صاحب کے والد بھی علامہ اقبالؒ کے چاہنے والے اور عقیدت مند تھے۔ اقبالؒ سے محبت انھیں وراثت میں ملی تھی۔

مرزا اللہ دتہ صاحب سے ان کی بہت بے تکلفی تھی۔ ایک دن ابا جی (نانا جان) شیو کر رہے تھے۔ شیشے میں انھیں مرزا اللہ دتہ نظر آئے۔ ان کا قد ذرا چھوٹا تھا فوراً مسکرائے اور اپنے بیٹے (ماموں محمود) سے کہنے لگے! ''بیٹا فوراً کرسی لے کر آؤ تمھارا مختصر چاچا آ گیا ہے۔ اُسے ملنا ہے اور اُسے کرسی پر کھڑا کروں گا۔ کرسی کے بغیر سینے سے سینہ نہیں ملے گا۔'' مرزا اللہ دتہ نے اسی انداز سے جواب دیا! ''ہم جیسے آدمی کو ملنے ضرورت ہی کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چل پڑے اور ابا جی انھیں منانے اُن کے پیچھے دوڑے اور گلے لگالیا۔ ابا جی اپنے بہت سے دوسرے دوستوں سے بھی بے تکلف تھے اور ایسے دوستوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ اپنے اور دوستوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں رہنے دیتے تھے۔ وہ قریبی دوستوں سے مذاق کرتے تھے لیکن مذاق ہمیشہ شگفتہ ہوتا تھا۔ وہ اخلاقی حدود کو کبھی پامال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی زبان ہمیشہ پاکیزہ ہوتی تھی۔

ایک بار میں نے ان کی گاڑی کو چابی لگائی اور اُلٹی گھمانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ چابی ٹوٹ کر پھنس گئی۔ ماموں ظہور اختر مجھ سے ناراض ہوئے اور ڈانٹنے لگے۔ ابا جی نے فرمایا! ''ظہور مت ڈانٹو! بچے اور بندر آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ ہر وقت محو حرکت رہتے ہیں۔ بچے کو مت ڈانٹو میں ٹیکسی میں چلا جاؤں گا''۔ وہ بچوں کے لیے کبھی بھی نازیبا الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ صاحب جائداد تھے لیکن ان کا پیسہ لوگوں کی فلاح کے لیے خرچ ہوتا تھا۔ اُن کا کوئی بنک بیلنس نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت بااختیار بھی رہے لیکن اپنے لیے ناجائز ذرائع سے کچھ نہیں بنایا۔ ان کے پاس وہی جائداد رہی جو انھیں ورثہ میں ملی تھی۔

مجھے بچپن میں اپنے پاس لاہور لے گئے۔ میں نرسری میں لاہور میں داخل ہوا۔

کلاس ون میں نے وہاں پڑھی اور کلاس ٹو میں راول پنڈی آ کر داخل ہو گیا۔ وہاں رہتے ہوئے بڑا سکون ملتا تھا۔ ان کی شفقت ہمارے لیے ایک نعمت تھی۔ ہم جب راول پنڈی آ گئے تو پھر بعض خاص ضروریات کے لیے ہم اُن کا انتظار کرتے تھے۔ گھر والے ہماری ساری فرمائشیں پوری نہیں کرتے تھے اور ٹال دیتے تھے۔ لیکن وہ ہماری ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ ہم اُن کے آنے پر اپنی سائیکلوں کی پوری مرمت کرواتے، پسند کے کپڑے خریدتے اور پسند کے کھلونے خریدتے تھے۔

بیگم کرنل (ر) سلطان ظہور اختر نے ملاقات میں یہ تاثرات ظاہر کیے

لوگ بہ حیثیت انسان بہ حیثیت سیاست دان اور بہ حیثیت افسر راجا حسن اختر کو جانتے ہیں اور میں انھیں ایک شفیق سُسر، ہمدرد رہنما اور قابل استاد کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ میں ان کے خاندان سے نہیں تھی لیکن انھوں نے مجھے پورے خاندان میں عزت دلوائی اور مجھے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کہ میرا تعلق دوسرے خاندان سے ہے۔ ساہی وال میں میرے والد صاحب سے راجا صاحب کے تعلقات قائم ہوئے وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے۔ میرے والد آخری دم تک ان کے شیدائی رہے اور میری شادی اسی تعلق کا نتیجہ ہے۔ میری شادی ان کے بڑے بیٹے کرنل ظہور اختر سے ہوئی اس طرح میں اُن کی سب سے بڑی بہو بن گئی۔ میں جب سُسرال میں آئی تو بہت چھوٹی تھی اس لیے راجا صاحب نے ہر معاملے میں میری خود راہ نمائی اور تربیت کی۔ وہ مجھے جس انداز سے تربیت دیتے تھے وہ بڑا انوکھا اور دل کش انداز تھا۔ وہ اتنے پیار اور اتنی محبت سے پیش آتے تھے کہ مجھے محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ دراصل وہ میری تربیت فرما رہے ہیں۔ باتیں آج یاد آتی ہیں تو ان کی حکمت عملی کی اہمیت سامنے آ جاتی ہے۔

ایک دفعہ راجا صاحب کے بچوں میں تھوڑے اختلافات ہوئے۔ میری نند عابدہ ساتھ تھیں، میں نے راجا صاحب سے کہا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ میری

جانب دیکھ کر مسکرائے اور مطمئن ہو گئے۔ مجھے کہا کرتے تھے بیٹی میرا خاندان گکھڑوں کا ہے۔ یہ خاندان دب کر نہیں رہتا بل کہ سر اُٹھا کر چلتا ہے۔ تم بھی اس خاندان سے مل کر چلو، تو میری ساس اُن سے کہتیں! ''آپ اچھے ہیں اس کو شیر بنا رہے ہیں اور اس سے ہم پر حکومت کروانا چاہتے ہیں۔'' وہ شادی کے وقت میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ میں پڑھنا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے راجا صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے ملاقات میں انھیں بتایا کہ میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں، انھوں نے فرمایا! ''آپ ضرور پڑھیں اور شادی بھی ضرور ہو گی''۔ میں مایوس ہوگئی کہ شادی ہوگئی تو پھر کس نے پڑھنا اور کس نے پڑھانا ہے۔ خیر شادی ہو گئی اور دو بچے پیدا ہوئے اور میں ان کی تربیت میں مصروف رہی۔ تعلیم حاصل کرنے کی امید بالکل نہ رہی۔ لیکن راجا صاحب قول کے پکے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے! ''بیٹی اب تم آگے پڑھ لو'' میں یہ سن کر خوش ہوئی اور انھوں نے مجھے کالج میں داخل کروا دیا۔ وہ پڑھائی میں میری مدد کرتے تھے اور جب میں بی اے کا امتحان دے رہی تھی تو وہ خود مجھے پرچے کے لیے لے جاتے اور واپس لاتے کیونکہ اُس وقت ظہور سوات چلے گئے تھے۔ میری ساس اُن سے کہتیں! ''لوگ بیٹیوں کو پڑھاتے ہیں آپ اس کو پڑھا رہے ہیں جو بہو ہے''۔ فرماتے ''میں نے اس کی شادی سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ تمھاری شادی تو اب ہو جائے گی لیکن تم تعلیم بعد میں بھی حاصل کرتی رہنا۔ میں اس وعدے کا پابند ہوں''۔

جب میں ان کے ساتھ ہوتی تو شام کو وہ ہر روز ایک وہ گھنٹے کے لیے میرے پاس بیٹھتے اور اگر زیادہ مصروفیت ہوتی تو اس وقت میں کمی کر لیتے۔ اس نجی نشست میں خاندانی معاملات زیرِ بحث آتے تھے۔ خاص طور پر اُن کے بیٹے مسعود بھی اس محفل میں شریک ہوتے تھے۔ راجا صاحب خاندان کے سربراہ بھی تھے اور سب کے دوست بھی۔ وہ خاندان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے تو محفل گلزار ہو جاتی تھی۔ اُن

کی موجودگی میں سب کو ایک سکون حاصل ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کی موجودگی میں مجھے نظر انداز نہیں کیا۔

وہ چھوٹے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے اور ان سے کھیل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک بار گھر آئے تو کہنے لگے! ''میں بہت تھکا ہوا ہوں اور آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم بچوں کو میرے پاس چھوڑ جاؤ وہ میرا جسم دبائیں گے''۔ میرے بچے چھوٹے چھوٹے تھے اس لیے میں نے کہا میں خود دباتی ہوں۔ جواب ملا ''نہیں تم سے میں یہ کام نہیں کرواتا۔'' میں نے کہا! ''آپ مجھے اپنی بیٹی نہیں سمجھتے؟ پھر کہا! ''اچھا پھر آجاؤ لیکن تم نے پاؤں کو ہاتھ نہیں لگانا صرف کندھے وغیرہ دبا دو'' میں جب یہ کام کر چکی تو فرمایا! ''اب تم کو چھوڑ جاؤ اور خود چلی جاؤ'' میں نے کہا! ''ابا جی یہ بچے آپ کو تنگ کریں گے اور آرام نہیں کرنے دیں گے۔ کہا! ''کوئی بات نہیں مجھے ان کی موجودگی میں سکون ملے گا''۔ میں دروازہ بند کر کے آگئی اور تھوڑی دیر کے بعد بچوں کے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بچوں سے کھیل رہے تھے اور وہ خوشی سے شور مچا رہے تھے۔ میں شور سن کر ان کے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ راجا صاحب گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور میرے دونوں بچے (تیمور اور نائلہ) ان پر سواری کر رہے ہیں۔ وہ بچوں کو خوش کرنے کے لیے چکر لگا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے غصہ آیا کہ وہ تھکے ہوئے ہیں اور یہ بچے ان کو تنگ کر رہے ہیں۔ لہٰذا میں نے دونوں کو تھپڑ دے مارے۔ اس پر وہ سخت ناراض ہوئے اور کہا! ''میری ساری تھکاوٹ تو ان بچوں نے دور کر دی ہے۔ تم نے انھیں کیوں مارا ہے؟ تمھیں معلوم نہیں کہ بچوں کے منہ پر تھپڑ مارنا گناہ ہے۔ تم نے بہت غلط کیا ہے اور بغیر اجازت کے اندر آگئی ہو''۔ میں شرمندہ ہوگئی اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ بچوں کے لیے کتنا نرم دل رکھتے ہیں۔

سیاست میں جب آئے تو وہ زیادہ تر راولپنڈی میں قیام کرتے تھے اور اکثر

اُن کی دعوتیں ہوتی تھیں۔ مجھے بتائے بغیر بعض اوقات کوئی دعوت دے دیتے اور گھر میں اچانک کافی مہمان آ جاتے تو میں گھبرا جاتی۔ حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے کہتے! ''بیٹی مجھے یاد نہیں رہا اور تمھیں بتا نہیں سکا۔ تم گھبراؤ مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمت کرو کھانا تیار ہو جائے گا۔'' وہ پھر میری بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اگر کھانے میں دیر ہو جاتی تو کبھی غصہ نہیں کرتے تھے۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو راجا صاحب نے جلسہ میں ایوب خان کی حمایت کا اعلان کرنا تھا۔ راجا صاحب کے لیے یہ بہت مشکل تھا اور گھر میں بیٹھے فاطمہ جناح کے پوسٹر بار بار دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی تقریر لکھتے پھر کاٹتے۔ پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ صبح تقریر ہے اور راجا صاحب پریشانی میں مبتلا ہیں۔ صبح تک بے چین رہے اور ۱۵/ اکتوبر کی صبح خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یہ صدمہ ہی دراصل ان کی موت کا سبب بنا۔ میں نے اُن کی موت کے بارے میں کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے خواب دیکھ لیا تھا۔ میں بہت گھبرائی لیکن اس کو محض خواب سمجھا اور دل کو تسلی دے لی۔ وفات سے تین چار دن پہلے ایک دن اپنے ایک دوست کی وفات پر اُن کے گھر تعزیت کے لیے گئے۔ واپس آئے تو کہنے لگے! ''بیٹی تمھارا ابا نہ ہوا تو کیا کرو گی؟'' میں نے کہا ''اباجی ایسا نہ کہیں''، کہا! ''بیٹی تمھارا ابا بھی ایک دن اس دنیا سے چلا جائے گا۔ جس طرح یہ میرا دوست گیا ہے''۔ میں چونکہ خواب دیکھ چکی تھی اس لیے بہت پریشان ہوئی۔ لیکن پھر دل کو سمجھا لیا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ اباجی سچ کہہ رہے ہیں اور ہمیں تین چار دن بعد ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے۔

اگر میں پریشان ہوتی تو ابا جان بھی پریشان ہو جاتے اور مجھے ایک باپ کی طرح تسلی دیتے تھے۔ مجھے ان کا بہت بڑا سہارا تھا۔ ان کی وفات سے میرا سہارا چھن گیا تھا۔ اب بھی جب کبھی میں زیادہ پریشان ہوتی ہوں تو اباجی کی قبر پر چلی جاتی ہوں اور آنسو بہا کر دکھ ہلکا کر لیتی ہوں۔ مجھے اُن کی قبر پر جانے کے بعد سکون

ملتا ہے اور بعض اوقات خواب میں ان سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔ اس طرح بھی مجھے سکون ملتا ہے۔

وہ چونتیس سال پہلے فوت ہوئے لیکن میرے دل اور دماغ سے وہ ابھی تک دور نہیں ہوئے۔ وہ میرے اپنے والد سے بھی زیادہ شفیق تھے۔ میں انھیں اپنے ذہن سے دور نہیں کر سکتی یہ میری مجبوری ہے۔ وہ میرے محسن تھے اس لیے مجھے ان کی چھوڑی ہوئی اشیاء، ان کے خاندان اور ان کی اولاد سے محبت ہے۔ میں اُن کا قرض تو نہیں چکا سکتی لیکن وہ ایسا پیغام محبت دے گئے ہیں جو کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔

اُن کی رحلت اُن کے خاندان کے لیے ایک بہت بڑا نقصان ہے اور میرے لیے بھی ایک بہت بڑا نقصان ہے جس کی تلافی کسی صورت میں نہیں ہو سکتی۔ میں ہر وقت ان کی مغفرت کے لیے دعا گو رہتی ہوں۔

وہ اتنے مصروف رہتے تھے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر تھک جاتے تھے۔ ایک دفعہ سمن آباد میں اپنے گھر کی بجائے غلطی سے دوسرے گھر میں چلے گئے اور آرام سے وہاں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا کوٹ اتار دیا۔ اہلِ خانہ خوشی سے دوڑے ہوئے آئے کہ راجا صاحب نے مہربانی کی ہے اور ہمارے گھر آئے ہیں۔ راجا صاحب نے اہلِ خانہ کو دیکھا تو احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گئے ہیں تو وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اُن کے ایک دوست عبدالعزیز ملک ایڈووکیٹ تھے۔ وہ بیمار ہوئے تو ابا جی اُن کی بیمار پرسی کے لیے گئے۔ عبدالعزیز نے کہا! ''راجا میں جا رہا ہوں، رب راکھا'' انھوں نے جواب دیا! ''نہیں بھائی دنیا میں دوستی نباہی ہے اب اُدھر بھی اکٹھے چلیں گے فکر مت کرو۔'' وہ واپس آئے اور ملک عبدالعزیز ۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کی صبح لاہور میں فوت ہوئے شام کو ان کا جنازہ ہوا۔ راجا صاحب کو ان کی وفات کے متعلق بتایا نہ گیا۔ وہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کی صبح خالق حقیقی سے جا ملے۔ انھوں نے

مرتے ہوئے بھی دوستی کی لاج رکھ لی۔

راجا حسن اختر کی بیٹی پروفیسر عابدہ احسان کی باتیں

ابا جان خوب صورت اور پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔ میں بہت چھوٹی تھی اور ایک بار یوم اقبالؒ کی تقریب یونی ورسٹی ہال لاہور میں غالباً ۱۹۶۲ء میں ہوئی، ابا جان نے سفید کپڑے اور غالباً بھورے رنگ کی شیروانی زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ بڑے پر کشش لگ رہے تھے۔ نیچے جلسہ گاہ میں مرد تھے اور اوپر گیلری میں عورتیں تھیں۔ جب تقریب میں راجا صاحب کو تقریر کے لیے دعوت دی گئی تو وہ اُٹھے، بعض عورتوں نے کہا ماشاءاللہ پر کشش شخصیت کا مالک ہے کسی خوش قسمت ماں کا بیٹا ہے۔

جب بھی یوم اقبالؒ ہوتا ابا جان اُس کے انتظام وانصرام میں لگ جاتے اور دوڑ دوڑ کر کام کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ کام کرتے تھک جاتے تو کسی پتھر یا سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے اور اپنے مرتبے اور عہدے کو پیشِ نظر نہ رکھتے۔ کبھی ان کی یہ خواہش بھی نہ ہوتی کہ وہ ضرور سٹیج پر بیٹھیں گے۔ وہ صرف عقیدت سے یومِ اقبال کے لیے کام کرتے تھے۔ ہر سال یومِ اقبال پر مقالہ لکھتے اور جب مقالہ پڑھ لیتے تو وہ میزبانوں کے حوالے کر دیتے اور کبھی سنبھالنے کی کوشش نہ کرتے۔ وہ کبھی نمائش نہ کرتے۔ جب محفل میں تصاویر بنائی جاتیں تو وہ پیچھے ہٹ جاتے دوسرے لوگ آگے بڑھتے اور تصویریں بنانے کی فکر میں ہوتے۔

میری پرنسپل کا نام اینا مولیکا احمد تھا۔ اُن کے خاوند شیخ احمد نے بھی مزارِ اقبال کا ڈیزائن بنایا تو وہ نامنظور ہو گیا۔ وہ بہت پریشان ہوا اور اپنی بیگم کو بتایا۔ مسز مولیکا احمد جانتی تھیں کہ راجا حسن اختر مزارِ اقبال کمیٹی میں ہیں انھوں نے مجھ سے کہا تمھارے والد کی وجہ سے شیخ احمد کا ڈیزائن نامنظور ہوا ہے۔ میں نے ابا سے پوچھا تو جواب ملا! ''مجھے شیخ احمد سے کوئی دشمنی نہیں تھی، درحقیقت اس ڈیزائن میں مزارِ

اقبال کے مینار اتنے بلند تھے کہ وہ شاہی مسجد کے مقابلے میں آ رہے تھے اس لیے میں نے اس کے خلاف رائے دی۔''

۱۹۶۳ء میں ایک پارلیمانی وفد انگلینڈ گیا۔ ابا اس کے ساتھ تھے۔ وہاں انھوں نے ہاؤس آف کامنز میں تقریر کی اور انگریزوں کے خلاف بولے کہ پاکستان بنانے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے لوگوں نے ناانصافیاں کیں۔ اس کو ذوالفقار علی بھٹو نے، جو وزیرِ خارجہ تھے محسوس کیا لیکن صدر ایوب خان نے کہا کوئی بات نہیں راجا صاحب نے حق بات کی ہے۔

وہ ہمیشہ حق بات کہتے تھے اور سچ کا ساتھ دیتے تھے۔ حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ بنائی اور شامل ہونے کے لیے کہا۔ ابا جان نے رائے دی کہ اس کا نام عوامی مسلم لیگ ہو۔ بات نہ مانی گئی اور وہ عوامی لیگ میں شامل نہ ہوئے۔ فوج اور فوج کی خدمات پر فخر کرتے تھے۔ مسعود بھائی کے کاغذات سول سروس کے لیے جمع کروائے اور پھر واپس لے لیے اور بھائی کو فوج میں بھیج دیا۔ وہ فوج میں چلے گئے اور وطن کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔ ابا جان کہا کرتے تھے! ''فوجی سچے لوگ ہیں اور یہ وطن کے لیے لڑتے ہیں۔''

میرے والد علامہ اقبالؒ کے ساتھ چوں کہ بہت چھوٹی عمر میں ہی ذہنی اور روحانی طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا زمانۂ طالب علمی میں جب بھی لاہور جاتے علامہ کے پاس ضرور حاضری دیتے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد تعلیمات اقبالؒ ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ چوں کہ شروع سے ہی بہت علمی ذوق رکھتے تھے اس لیے انگریزی ادب اور فارسی ادب پر انھیں بہت عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اقبالؒ کے فلسفے کو سمجھنے کے لیے گوئٹے اور نطشے اور دیگر فلاسفروں کے فلسفہ کو کھنگال ڈالا۔ مولانا رومی کا مطالعہ نہایت باریک بینی سے کیا۔ کتب بینی کا شوق اس قدر تھا کہ اگر کوئی اچھی کتاب ہاتھ میں آ جاتی تو جب تک اُسے ختم نہ کر لیتے چین سے نہ

بیٹھتے۔ کتاب پڑھتے وقت اپنے اردگرد کے ماحول سے بالکل بے نیاز ہو جاتے۔ ابا جان کا کہنا تھا کہ انھوں نے زیادہ تعداد میں کتابیں ریل یا کار میں پڑھیں۔ کتب بینی کا شوق اپنی جگہ، کتب خریدنے کا بھی بہت شوق تھا۔ پہلے وقتوں میں بھی پرانی کتابوں کی نیلامی ہوتی تو ابا جان ضرور ان میں سے نایاب اور پرانی کتابوں کی خریداری کرتے تھے۔ ہماری لائبریری کی زیادہ تر کتابیں ان نیلامیوں ہی کی وجہ سے لائبریری میں شامل ہوئیں۔ میرے ابا کسی کتاب کے تحفے کو بہت قیمتی سمجھتے تھے۔ میں جب بھی ابا کے ساتھ کسی کے گھر یا کسی تقریب میں گئی تو عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا کہ دوسرے لوگوں نے میزبان کے گھر کی خوب صورت اور قیمتی اشیاء کی تعریف کی اور اس طرح کی آراء قائم کیں! ''یہ قالین نہایت عمدہ ہے، یا یہ فانوس غضب کا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' مگر میرے ابا کی نظر سب سے پہلے کسی کونے یا الماری میں رکھی ہوئی کتابوں پر جاتی تھی۔ جب کوئی اچھی کتاب اُن کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ دوسرے لوگوں سے بالکل بے خبر ہو جاتے۔ بعض اوقات اس طرح بھی ہوا کہ ہم کسی دوست کے شاندار بنگلے سے واپس آئے تو کسی نے آ کر کہا! ''اُن کے کمرے کی فلاں چیز بڑی شاندار تھی'' تو اس پر ابا حیران ہو کر پوچھتے! ''وہ چیز کہاں تھی میں نے نہیں دیکھی''۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یا تو انھوں نے صاحبِ خانہ سے باتیں کیں یا کتابوں کو دیکھا۔ باقی اشیاء پر انھوں نے نظر ہی نہیں ڈالی نہ اُنھیں یاد رکھا۔

اُنھیں دو چیزیں بہت پیاری تھیں۔ انسان اور کتابیں۔ میرے والد درویش صفت انسان تھے۔ ان کے نزدیک دنیاوی نمائش کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ انسان کی قدر چیزوں سے نہیں بل کہ اپنی شخصیت سے ہوتی ہے۔ یہ اُن کا خیال تھا۔ اُن کے نزدیک تخت اور چٹائی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جو چیز اہم تھی وہ یہ تھی کہ اس پر بیٹھنے والا انسان کیسا ہے۔ اگر انسان عظیم ہے تو وہ چٹائی بھی تخت سے بڑھ کر ہے اور اگر گھٹیا

انسان تخت پر بیٹھا ہے تو اس تخت کی وقعت چٹائی سے بھی کم ہے۔

اچھا کپڑا اور اچھا جوتا شوق سے پہنتے تھے۔ وہ نہایت خوش لباس تھے۔ رومال، گھڑی اور دھوپ کا چشمہ جہاں بیٹھتے وہیں بھول کر آ جاتے۔ لہٰذا یہ چیزیں اکثر گم ہوتی رہتی تھیں۔

ابا کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ رسول پاک ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ وہ زندگی کے حقائق سے فرار حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اصل زندگی کو دیکھنے کے عادی تھے۔

حضرت علامہ اقبال کو اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ قائد اعظم کو قابلیت اور ذات سے بہت متاثر تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا قائد اعظم کو سمجھتے تھے اور دل و جان سے ان کی قدر کرتے تھے۔ اقبالؒ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ ان کا کلام پڑھنا، سننا اور سنانا اُن کی عبادت تھی۔ جب ہم چھوٹے تھے تو وہ صبح کے وقت ہم سب بہن بھائیوں کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور اونچی اونچی آواز میں ہمارے ساتھ گاتے:۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم ، وطن ہے سارا جہاں ہمارا[42]

مجھے یاد ہے یہ شعر گاتے ہوئے ایک عجیب سماں پیدا ہوتا تھا۔ ابھی تک وہ مناظر میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مشاہیر اسلام حضرت خالد بن ولید، طارق بن زیاد، سلطان صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور بابر وغیرہ کے علاوہ صلیبی جنگوں کے قصے ہمیں سناتے۔ ہم اگر انھیں کوئی نظم یا کہانی سناتے تو وہ بڑے شوق سے سنتے اور خوش ہوتے اور مناسب حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کو بہت افضل سمجھتے تھے۔ اقبالؒ کے یہ اشعار اکثر سناتے تھے:۔

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سال خورد
ہے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر!
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں[۱۸]

بال جبریل کی نظم ''شاہین'' کے یہ اشعار بھی اکثر سناتے اور گنگناتے رہتے:۔

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری
جواں مرد کی ضربت غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ[۱۹]

اقبال کا کلام ان کو حفظ تھا۔ اپنی نجی اور ادبی محفلوں میں گھنٹوں کلام اقبالؒ پر باتیں کرتے اور موقع کے مطابق اقبالؒ کے شعر پڑھتے۔علامہ کے اشعار کی تشریح کرنے کے لیے وہ گھنٹوں تک بول سکتے تھے۔

ہمارے گھر میں ابا جان کی لائبریری ایسی جگہ تھی جہاں پر ابا اپنا فارغ وقت صرف کرتے تھے۔اگر کوئی اُن سے کتاب مانگتا تو کبھی انکار نہ کرتے لیکن یہ ضرور کہتے! ''پڑھ کر واپس کر دینا۔'' لیکن لوگ جانتے تھے راجا صاحب کو کتاب دے کر یاد نہیں رہتی کہ کس کو دی ہے اس لیے بہت کم کتابیں واپس آتیں۔اس طرح لوگوں

کی لائبریریاں بڑی ہوتی رہیں اور ابا کی کتابیں ضائع ہوتی رہیں۔ وہ لائبریری میں جانے سے کسی کو منع نہ کرتے تھے لیکن افسوس کہ ان کی بہت سی قیمتی اور نایاب کتابیں غائب کر دی گئیں۔ ابا جان کے مرنے کے بعد بھی ہم اُن کی کتابوں کی حفاظت نہ کر سکے۔

مجھے یاد ہے ابا کے پاس علامہ اقبالؒ کی تصاویر کا ایک نایاب مجموعہ تھا۔ ہر سال یوم اقبال پر ایک تصویر چھپوانے کے لیے اس میں لوگ لے جاتے تھے جو کبھی واپس نہیں ملتی تھی۔ اس طرح بہت سی قیمتی تصویریں لوگوں کی ملکیت بن گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ ابا نے اقبالؒ پر بہت سے مقالات لکھے جو مختلف لوگ اپنے رسالوں یا اخبارات میں چھاپنے کے لیے لے جاتے تھے اور واپس نہیں کرتے تھے۔ ابا جان بھول جاتے تھے۔ ابا جان ان مقالات کی نقل بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ اس طرح ان کے بہت سے مقالات لوگوں نے اپنے نام سے منسوب کر لیے۔ اپنے طبعی فقر کی وجہ سے اس بات سے ہمیشہ بے نیاز رہے کہ ان کی تحریروں کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو۔ ہم چھوٹے تھے ورنہ شاید ہم ان کی تحریروں کو محفوظ کر لیتے۔ بعض اوقات کلام اقبال کی تشریحات اُن کی زبان سے سن کر لوگوں نے اُن کے پاس بیٹھ کر لکھیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے میرے ابا کی ساری مصروفیات تحریکِ پاکستان کے لیے تھیں۔ وہ سرکاری ملازم تھے اس کے باوجود سارا دن دفتر میں لگانے کے بعد ساری شامیں اور بعض اوقات پوری پوری راتیں تحریک پاکستان کے لیے کام کرتے ہوئے گزر جاتیں۔ ان دنوں میں ابا نے نام بدل بدل کر اخبارات میں کالم بھی لکھے۔ والدہ بالکل گھریلو خاتون تھیں۔ ہم لوگ چھوٹے تھے لہٰذا وہ ساری تحریریں بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ پرجوش سپاہی کی طرح اپنے دفتری

فرائض انجام دیتے۔ وہ ہر سال یومِ اقبال میں بھرپور حصہ لیتے اور ہر سال ایک مقالہ لکھ کر پڑھتے تھے۔ اور بعد میں جب مصروفیات بڑھتی گئیں تو زبانی تقریر کرتے جو کلام اقبال اور تعلیمات اقبال سے مزین ہوتی۔ کاش ہمیں اتنی عقل ہوتی کہ ہم یہ سب کچھ محفوظ کر لیتے تو اس وقت ہمارے پاس اُن کے افکار و مقالات کا ایک خزانہ ہوتا لیکن افسوس کہ فکر اقبال کا ایک بڑا خزانہ زیر زمین چلا گیا۔ انھوں نے خود بھی اپنے مقالات اور تقاریر کو جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ خود یا ان کے احباب میں سے کوئی یہ سب کچھ محفوظ کر لیتا تو ہمارے پاس صرف ''حسن آفاقی'' کتاب ہی نہ ہوتی بل کہ اقبال شناسی اور فکر اقبال پر لکھی کتابوں کا ایک قابلِ قدر خزانہ موجود ہوتا۔

دیکھا بھی دکھایا بھی سنایا بھی سنا بھی
ہے دل کی تسلی نہ نظر میں نہ خبر میں

محمود اختر کیانی ریٹائرڈ ڈپٹی سیکریٹری چک ۱۰۴/۱۲ ایل حال مقیم ساہی وال نے بتایا

راجا حسن اختر مرحوم و مغفور ابا حضور کے بچپن کے جگری دوست تھے۔ سول سروس میں تعیناتی ہوئی تو راجا صاحب نے ریوینیو کی فیلڈ ٹریننگ ساہی وال میں کی اور اس عرصے میں وہ اکثر ابا جان کے ساتھ ہمارے گھر آتے اور یہاں ٹھہرتے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت راجا صاحب گورداسپور میں بطور اے ڈی ایم تعینات تھے۔ پاکستان بنتے ہی انھیں ساہی وال میں ڈپٹی کمشنر لگا دیا گیا۔ مہاجرین کی دیکھ بھال اور ان کی بحالی کا کام انھوں نے بڑی ہی جانفشانی اور محنت سے رات دن ایک کر کے سرانجام دیا۔ ہندو سکھ بڑی بڑی جائدادیں چھوڑ گئے تھے۔ انھوں نے ایسی تمام جائدادیں مہاجروں کو الاٹ کرنے کی کوشش کی۔

غالباً یہ مذاق تھا کہ ایک دن راجا صاحب نے ابا جان سے کہا ''تم زمین کیوں نہیں الاٹ کروا لیتے؟ تمھارے لیے تو یہ مشکل نہیں!'' والد صاحب نے بڑی

سنجیدگی سے کہا! ''حسن اختر! نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے لوگ تمھاری طرف انگلیاں اُٹھائیں اور تم بدنام ہو جاؤ''۔ باوجود غربت کے والد صاحب نے ایک سو مکمل بستر نئے بنوا کر راجا صاحب کو دیے کہ وہ مہاجرین میں تقسیم کریں۔ والد صاحب نے کبھی کسی کی ناجائز سفارش نہیں کی تھی۔

سر جوگندر سنگھ فوت ہو چکا تھا۔ اس کی لیڈی جو کہ ایک انگریز خاتون تھی وہ بھی تقسیم ہند کے وقت ہندوستان چلی گئی۔ اس وقت کے گورنر سر فرانسس موڈی نے راجا صاحب کو حکم دیا کہ اقبال نگر سٹیٹ (جو کہ ہزاروں ایکڑ پر مشتمل تھی) لیڈی جو گندر سنگھ کے بیٹوں کو الاٹ کی جائے۔ راجا صاحب نے کہا! ''ایسے نہیں ہو سکتا۔ اب یہ پاکستان کی پراپرٹی ہو گئی ہے۔ میں قائد اعظم سے بات کروں گا اور یہ الاٹمنٹ موزوں لوگوں کو کی جائے گی۔'' اس پر فرانسس موڈی اور راجا صاحب کی لڑائی شروع ہو گئی۔ کیس ہائی کورٹ تک گیا۔ راجا صاحب کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ دوستی کو ہر حال میں نبھانے کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔

ابا حضور اور راجا صاحب کے پیار کا یہ عالم تھا کہ ایک روز بڑے صنعت کاروں، ٹاٹا اور برلا کے مالکوں، جو راجا صاحب کے دوست تھے۔ راجا صاحب کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ والد صاحب ان دنوں راجا صاحب کے پاس لاہور ٹھہرے ہوئے تھے۔ راجا صاحب نے اُن سے کہا! ''تم میرے ساتھ چلو گے'' والد صاحب نے جواب دیا! ''دیکھو وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ میں ایک سادہ اور غریب آدمی ہوں مجھے ایسی دعوتوں میں ساتھ نہ لے جایا کرو''۔ راجا صاحب نے مانے اور رات کو انھیں دعوت میں لے گئے۔ فلیٹز ہوٹل میں عشائیہ کا بندوبست تھا۔ ٹاٹا، برلا اور بڑے افسران راجا صاحب کو خوش آمدید کہتے ہوئے اندر ہال میں لے گئے۔ والد صاحب موقع پا کر وہاں سے نکل پڑے اور ریلوے سٹیشن چلے گئے کہ رات دس بجے والی پسنجر گاڑی سے واپس کسووال چلے جائیں۔ راجا صاحب نے کھانا شروع

ہونے سے پہلے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو یار کا کُلا اور لنگی نہ دیکھ کر پریشان ہوئے اور فوراً میزبان سے پوچھا! ''وہ میرے ساتھ لنگی والا آدمی تھا وہ کہاں ہے؟'' میزبانوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ جب راجا صاحب اندر داخل ہوئے تو وہ واپس چلے گئے تھے۔ راجا صاحب فوراً سمجھ گئے کہ وہ ضرور گھر جانے کے لیے ریلوے سٹیشن گیا ہوگا۔ گاڑی کا وقت ہے۔ راجا صاحب نے میزبانوں سے کہا! ''میں دس پندرہ منٹ میں آتا ہوں پھر کھانا کھاؤں گا''۔ برلا اور ٹاٹا کارخانوں کے مالک بھی راجا صاحب کے ساتھ چل پڑے۔ جب یہ حضرات ریلوے سٹیشن پہنچے تو پلیٹ فارم پر والد صاحب ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ راجا صاحب نے مرزا صاحب کو دبوچ لیا۔ پھر گلے شکوے اور ہنسی مذاق کے بعد اُنھیں ہوٹل میں لے آئے اور کھانا شروع ہوا۔

پروفیسر عبدالقادر، سابق استاد گورنمنٹ کالج ساہی وال، حال موضع گڈاری تحصیل سوہاوہ ضلع جہلم

راجا حسن اختر اس وقت شیخوپورہ میں افسر مال تھے جب میرا ان سے رابطہ ہوا۔ اس کے بعد ساہی وال میں بھی ان سے رابطہ رہا۔ وہ حضرت علامہ اقبالؒ کی وفات سے پہلے شیخوپورہ میں آ گئے تھے۔ راجا حسن اختر ہمارا ہیرو اور نوجوانوں کا لیڈر تھا۔

راجا صاحب کا تعلق عالمِ استغراق سے تھا۔ وطن سے محبت کا استغراق انسانیت سے محبت کا استغراق خدمتِ خلق کا استغراق اور کلام اقبال اور حضرت علامہ اقبالؒ سے عقیدت کا استغراق ان کا سرمایہ حیات تھا۔ لوگ آج کل وجدانی اور استغراقی حیات کے لطف سے بے خبر ہو گئے ہیں، سوز و گداز اور کیف کی لذتوں سے ناآشنا ہو گئے ہیں۔ لیکن راجا صاحب کے ہاں یہ سب کچھ نظر آتا تھا۔

راجا صاحب نے مجھے خود بتایا کہ علامہ اقبالؒ کی وفات کے وقت وہ ان کے گھر موجود تھے۔ راجا صاحب حسن اختر کہنے لگے، علامہ نے پوچھا! ''قریشی صاحب کہاں

ہیں؟''(قریشی صاحب ان کے معالج تھے) میں نے عرض کیا! ''وہ بہت تھک گئے تھے اس لیے چلے گئے ہیں'' فرمایا! ''کاش انھیں علم ہوتا کہ مجھے کتنی تکلیف ہے''۔میں نے کہا! ''حضرت میں انھیں جا کر لے آتا ہوں پھر میں کار کی طرف دوڑا۔اتنے میں علی بخش نے آواز دی ''راجا صاحب، جلدی ادھر آئیں، جلدی ادھر آئیں، میں نے جب حضرت علامہ کے پاس پہنچا تو اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔میرے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا''۔

راجا صاحب ملازمت میں گورداسپور بھی رہے۔وہ جہاں بھی ہوتے افسری کم اور لیڈری زیادہ کرتے تھے۔وہاں لوگوں سے خوب تعلقات قائم کیے۔جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو انھیں ساہی وال میں بطور ڈپٹی کمشنر تعینات کیا گیا۔پاکستان بننے پر بہت سے مہاجر اس طرف آئے اور گورداسپور سے بہت لوگ ساہی وال میں آ گئے۔انھوں نے رات دن اُن مہاجروں کی بحالی کے لیے کام کیا۔رہتک سے بھی راجپوت آ گئے۔راجا صاحب نے ان کی بحالی کے لیے انتھک محنت کی۔اگر راجا صاحب ان سے کہتے ''کہیں اور چلے جاؤ'' وہ جواب دیتے، ''یہیں رہیں گے۔'' راجا صاحب یہ سن کر ہنس دیتے اور ان کی بحالی کے لیے کام کرنے لگتے۔نواب ممدوٹ نے اسمبلی میں بڑے فخر سے کہا تھا ''راجا حسن اختر اس کام کے لیے میرا انتخاب ہے اور وہ یہ کام خوب کر رہا ہے۔'' نواب ممدوٹ نے اس کا کریڈٹ لیا۔راجا صاحب جب اپنا کام کر رہے ہوتے تھے تو انھیں کھانا پینا بھی بھول جاتا تھا۔رہتک والوں پر فائرنگ ہو گئی۔اُس وقت راجا صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔چودھری خلیق الزمان مسلم لیگی لیڈر کا بیان تھا ''راجا حسن اختر موجود نہیں تھے ورنہ کبھی فائرنگ نہ ہوتی۔

میری راجا حسن اختر سے خط و کتابت تھی۔انھوں نے زندگی میں مجھے چند خطوط لکھے لیکن وہ ضائع ہو گئے۔ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں کچھ عرصہ ان کی خدمت میں

حاضر نہ ہوا۔ ان کا ایک خط آیا جس کا ایک جملہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ ''عبدالقادر آپ اتنے کم آمیز تو نہیں تھے''۔ بعض اوقات بے ساختہ جملے ان کے منہ سے نکلتے تھے جو بہت پر اثر ہوتے تھے۔ ایک بار میں نے انھیں جگایا وہ گہری نیند میں تھے اور تھکے ہوئے تھے۔ میں نے کہا! اُٹھیں، اُٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ فوراً بولے! ''میں (کلاک ٹائم) کا پابند نہیں ہوں''۔

ایک بار خواتین کے متعلق لمبی گفت گو ہوئی۔ فلسفیانہ باتیں ہوئیں اور یونانی فلسفے پر بحث ہوئی۔ انھوں نے کہا! ''مختصر ترین بات یہ ہے کہ وہ مائیں ہیں''

طاہرہ کیانی دختر راجا حسن اختر کے خیالات

ابا جی جب بھی گود میں بٹھاتے تھے تو پیار کرتے تھے اور ساتھ ساتھ جھومتے تھے۔ پھر وہ عام طور پر دو نظمیں ترنم سے پڑھ کر ہمیں سناتے تھے:۔[۴۰]

یا رب: دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے[۴۱]
چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا[۴۲]

وہ اتنی پر سوز آواز میں سناتے تھے کہ سمجھ نہ ہونے کے باوجود یہ اشعار دل میں اُترتے جاتے تھے۔ پھر اُن کا پیار اور ساتھ جھومنے کا انداز بڑا ہی پر کیف ہوتا تھا۔ وہ لمحے اب کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ وہ جھومتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کیا کرتے تھے۔ جو پیار میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں اور فوراً دل میں اُتر جاتی تھیں۔ بعض اوقات وہ کلیلہ و دمنہ کی داستان کا کوئی حصہ سنا دیتے اور پھر سمجھانے کی کوشش کرتے تھے ان کے سمجھانے کا انداز بہت پر اثر ہوتا تھا۔ فلسفۂ اقبال اور اقبال کی خودی پر گفت گو کرتے تو بہت لطف آتا تھا۔ وہ ہمیں خودی اور خودداری کا درس دیتے تھے۔ وہ یہ شعر بھی عام پڑھا کرتے تھے۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن[۴۳]

وہ فرماتے! "تمھارا باپ غریب ہے اور خودداری سے زندگی گزار رہا ہے۔ انھوں نے کبھی بڑائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ قناعت پسند تھے اور کنجوسی سے انھیں نفرت تھی۔ وہ امی سے کہا کرتے تھے میں امیر آدمی نہیں ہوں اس لیے تمھیں میرے ساتھ صبر وشکر سے رہنا ہوگا۔ پھر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:۔

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر![۴۴]

شعر پڑھ کر امی کو اس انداز سے سمجھاتے تھے کہ اُن پر ان کی بات کا اثر ہوتا اور وہ دل سے اس کو قبول کرتی تھیں۔ کلام اقبال کو وہ باعث برکت سمجھتے تھے۔ انھوں نے زندگی میں کلام اقبال کو پڑھا سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ ان کی نجی اور مجلسی زندگی میں رسول اکرم ﷺ کے بعد اقبال ان کے لیے سب کچھ تھے۔ وہ بڑے احترام سے ان کا نام لیتے۔ میں نے بھی ابا جی سے متاثر ہو کر کلام اقبال پڑھا اور پتہ چلا کہ کلام اقبال مسلمانوں کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے۔ جب میں کلام اقبال کو پڑھا تو محسوس ہوا کہ میرا باپ اقبال کا مردِ مومن ہے۔ ابا جی نے کلام اقبال سے بہت اثر لیا تھا۔

تحریک پاکستان میں یا پاکستان بننے کے بعد ابا جی نے جہاں بھی محسوس کیا کہ کوئی غلط کام ہو رہا ہے۔ وہاں وہ ضرور بولے اور اختلاف کیا۔ لاہور ہمارے گھر ۱۱۶ گلبرگ میں سیاسی نشستیں ہوتی تھیں جن میں حسین شہید سہروردی اور مسعود صادق وغیرہ آتے تھے ایک مرتبہ ابا جی کراچی گئے اور خبر ملی کہ حسن شہید سہروردی کو وزیر اعلیٰ کا یا کوئی دوسرا بڑا عہدہ دیا جا رہا ہے اور راجا صاحب وزیر بنائے جائیں گے۔ اس وقت سہروردی نے ایک سیاسی جماعت کھڑی کی جس کا نام عوامی لیگ رکھا۔ راجا صاحب نے سہروردی سے کہا جس پارٹی کے نام میں جناح اور مسلم کا لفظ نہیں میں اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ سہروردی ناراض ہو گئے اور راجہ صاحب وزیر نہ بنے۔

نیچے راجا صاحب سے ناراض ہوئے کہ انھوں نے کیا کیا۔ فرمایا ''میرا قلبی مسئلہ یہ ہے کہ میں مسلم لیگ قائداعظم اور پاکستان سے ہٹ کر عہدہ حاصل نہیں کر سکتا''۔ وہ مسلم لیگ اور پاکستان کے لیے خلوص نیت سے کام کرتے تھے۔ اُن کو نمود و نمائش کی خواہش نہیں تھی۔ وہ جلسوں اور اہم تقاریب کے لیے کام کرتے تھے لیکن جب تصاویر بنتیں تو وہ غائب ہو جاتے۔ انھیں کسی صلہ کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تحریک پاکستان، مسلم لیگ اور قائداعظم کے لیے بے لوث کارکن رہے۔

وہ ہمیں کہا کرتے تھے! ''دیکھو بیٹا، چیونٹی بہت چھوٹی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی خوراک تلاش کرنے کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہے۔ آپ لوگ بھی اس چیونٹی کی طرح محنت کریں اور اپنی محنت پر بھروسہ کریں۔'' جب اُن کی ملازمت اچانک گئی تو وہ پریشان نہیں ہوئے۔ اس پریشانی اور تنگدستی کے عالم میں بھی ان کی شفقت اور رویے میں فرق نہ آیا۔ انھوں نے امی سے کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا۔ انھوں نے دوسری شادی بھی کی تو ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ان کے رویے میں تبدیلی آئی ہو یا ہمارے حقوق پورے نہیں ہوئے ہوں۔ امی سے پہلی شادی تھی بعد میں دوسری شادی کی۔ شادی کرنے کے بعد بڑی آہستگی سے امی سے کہا! ''بیگم میں نے دوسری شادی کر لی ہے لیکن میں تمھیں خوش رکھوں گا تم ناراض نہ ہونا۔ اس کے بعد واقعی امی ہمیشہ خوش رہیں اور انھیں کبھی کوئی شکوہ نہ ہوا۔ ابا جی دونوں بیویوں میں پورا پورا انصاف کیا۔

ابا جی بہت نرم مزاج آدمی تھے۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کبھی نوکروں کو ڈانٹا ہو۔ کوئی آدمی اُن سے ملنے کسی وقت بھی آ جاتا تو محسوس نہ کرتے۔ بعض اوقات وہ کہتے میں بہت تھکا ہوا ہوں مجھے بہت آرام کی ضرورت ہے۔ اور اگر اسی اثنا میں کوئی آ جاتا تو اٹھ جاتے بعض اوقات لوگ آدھی رات کو ملنے آ جاتے۔ امی کہتیں دیکھیں آدھی رات ہے اور آرام کا وقت ہے اور ملنے والے لوگ

آ گئے ہیں۔ جواب دیتے ”کوئی بات نہیں بے چارے کسی غرض سے آئے ہوں گے۔ خدا نے مجھے وسیلہ بنایا ہے تو میرے لیے سعادت ہے۔“

وہ ہمیں اکثر پڑھنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ کوئی نہ کوئی کتاب بھی پڑھنے کو دیتے تھے۔ ہمیں سبق آموز کہانیاں سناتے اور کہتے۔ دیکھو ندی بہتی ہے تو اس میں زندگی ہے رُک جائے تو اس میں زندگی نہیں رہتی۔ انسان کو بھی زندگی کا شعور ہونا چاہیے۔ پھر یہ شعر بھی پڑھتے:

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ[۴۵]

گھڑ سواری اور ورزش کو پسند کرتے تھے اور میرے بھائیوں کو بھی ورزش کرنے کے لیے کہتے۔ ایسے موقعوں پر یہ مصرعہ ان کی زبان پر ہوتا تھا۔

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہین کا جہاں اور[۴۶]

جب الیکشن کے لیے اباجی نے کاغذات داخل کروائے تو ہمیں پتا چلا کہ ان کے کاغذات مسترد ہو گئے ہیں۔ ہمیں اس کا بہت دکھ ہوا لیکن وہ بالکل مغموم نہیں ہوئے۔ اسی طرح جب انھیں ملازمت سے برخاست کیا گیا تو وہ غمزدہ نہیں ہوئے اور وکالت میں داخلہ لے لیا اور پڑھ کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ بڑے غیور تھے۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا انھیں گوارا نہ تھا۔ وہ اپنی محنت سے ہماری پرورش کرتے رہے اور ہمیشہ ہمت سے کام لیا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا حضرت علامہ اقبالؒ ان کے پیر و مرشد تھے۔ وہ اقبالؒ کے خلاف کسی کی کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔

غلام محی الدین اثر ہمارے ایک پروفیسر تھے۔ وہ ہمیں اقبالیات پڑھاتے تھے اور وہ خود اقبالؒ کے خلاف تھے۔ وہ کلاس میں پڑھانے سے پہلے اقبالؒ پر تنقید کرتے اور اُن کے خلاف باتیں کرتے۔ میں نے اباجی کو یہ سب کچھ بتایا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا ”یہ پروفیسر حضرت علامہ اقبالؒ کی کردار کشی کرتا ہے؟“ میں نے

کہا ہاں کرتا ہے۔ اس پر ابا جی کو بہت دکھ ہوا اور انھوں نے اس کو معطل کروا دیا۔ دوسرے دن اثر صاحب کلاس میں آئے اور کہنے لگے ''یہاں ایک محترمہ ہیں جن کا خیال ہے کہ میں باوضو ہو کر اقبال کا نام لیا کروں'' انھوں نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا لیکن میرا نام نہ لیا۔ لیکن میں نے کلاس سے واک آؤٹ کیا۔ ابا جی فرماتے تھے قرآن سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے کلام اقبال ایک مقدس کلام ہے۔ جب پروفیسر محی الدین اثر معطل ہوئے اس وقت ڈاکٹر عبداللہ پرنسپل تھے۔ وہ کہنے لگے۔ ''بیٹا تمھارے ابو نے پروفیسر اثر کو معطل کروا دیا ہے۔ وہ مجھ سے بات کرتے تو ہم اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرتے۔ یا تمھیں محسوس ہوا تھا تو تم مجھے بتاتیں''۔ میں نے ابا جان کو بتایا تو انھوں نے ڈاکٹر عبداللہ کو ایک خط لکھا جس میں تحریر تھا۔ ''میں اپنے بچوں کے اساتذہ کا بہت احترام کرتا ہوں لیکن جو شخص دشمنِ اقبال ہو اسے میں برداشت نہیں کر سکتا یہ میری مجبوری ہے۔ آپ اسے محسوس نہ کریں اور مجھے معاف کر دیں۔'' اس پر ڈاکٹر عبداللہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

بیٹیاں ہمیشہ ماں کے قریب ہوتی ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم ابا جی کے زیادہ قریب تھیں۔ ہم اوٹ پٹانگ کہانیاں اور مضمون لکھ کر اُن کو دیکھاتیں تو وہ بہت خوش ہوتے اور حوصلہ افزائی کرتے، دیکھ کر کہتے! ''واہ، میری بیٹی نے بہت اچھا لکھا ہے۔ شاباش! بہت اچھا۔ لکھا کرو اور ضرور لکھا کرو'' اس طرح ہماری خوب حوصلہ افزائی ہوتی۔ وہ اولاد سے پیار کرتے تھے۔ ایک بار مجھے چھوٹا سا زخم چہرے پر لگا۔ میں بہت روئی تو میرا منہ ہاتھ میں پکڑ کر کہنے لگے ''میرا بیٹا چاند ہے اور چاند پر داغ ہوتا ہے۔ میرے بیٹے کو یہ داغ اچھا لگے گا۔ چپ ہو جاؤ اب رونا نہیں''۔ میں خوش ہوگئی اور خاموش ہوگئی۔

وہ بہت شفیق اور ہمدرد تھے۔ شادیوں کے بعد بھی وہ اپنی بیٹیوں کی امداد کرتے رہے۔ وہ اس بات کی کبھی نمائش نہیں کرتے تھے۔ نواسوں اور نواسیوں

سے بھی بہت پیار کرتے تھے۔ وہ اُن سے فرمائشیں کرتے تھے۔ انھیں بچوں کی پڑھائی کا بھی خاص خیال رہتا تھا۔ ہمارے زمانے میں دیہاتوں کے لوگ بہت کم بیٹیوں کو پڑھاتے تھے لیکن ابا جان نے ہم بہنوں کی پڑھائی پر توجہ دی۔ ہماری بڑی باجی نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی۔ ایک بہن نے بی اے کیا اور ہم دو بہنوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔

میں بعض اوقات اُن سے پوچھ لیتی! ''ابا جی، آپ نے دوسری شادی کیوں کی ہے۔'' وہ قطعاً محسوس نہ کرتے اور مسکرا کر جواب دیتے! ''بیٹے غلطی ہو گئی ہے۔ ابو کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔'' میں یہ سن کر شرمندہ ہو جاتی۔ ہماری دوسری امی بٹالہ سے آئی تھیں اور مہاجر تھیں۔ وہ مہاجروں کی خدمت کرتی تھیں کیوں کہ وہ ڈاکٹر تھیں۔ ابا جان مہاجرین کو سیٹل کر رہے تھے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک ہم درد خاتون ہے۔ شاید اُس وقت ایسی خاتون ان کی ضرورت تھی اس لیے شادی ہو گئی۔

۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کو میری شادی ہوئی۔ ۱۲ یا ۱۳ اکتوبر کو ہم ہنی مون منا کر ایبٹ آباد سے راول پنڈی آئے۔ مجھے کہا! ''آؤ بیٹا میری گود میں بیٹھو'' میں نے جواب دیا۔ ابا جی میں اتنی بڑی ہوں، میں کیسے گود میں بیٹھوں؟ مجھے شرم آ رہی تھی لیکن انھوں نے مجھے گود میں بٹھا لیا اور پیار کیا۔ وہ پیار نہیں بھولتا۔ وہ ابا جی کا آخری پیار تھا۔ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا پیار اسی لیے کر رہے ہیں کہ ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ وہ فرمانے لگے! ''میں پشاور گیا تھا۔ وہاں جلسہ تو بہت کامیاب رہا لیکن محترمہ فاطمہ جناح کو الیکشن میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ یہ بہت غلط ہوا ہے۔ لوگ اُن کے خلاف باتیں کرتے ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ مجھے ایوب خان کی بھی قربت حاصل ہے لیکن دوسری طرف میرے قائد کی بہن اور مادرِ ملت ہے۔ میرے لیے یہ حالات پریشان کن ہیں''۔ ہم دوسرے دن لاہور آ گئے۔ ۱۴ اکتوبر ہم نے امی سے ملاقات کی۔ ۱۵ اکتوبر صبح فون آیا۔ محمود بھائی کا

فون تھا۔ آواز آئی! ''طاہری جی! ابا جی کے متعلق خبر آئی ہے انھیں اٹیک ہوا ہے اور ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ہم راول پنڈی جا رہے ہیں فوراً تیار ہو جاؤ۔'' ہم راول پنڈی پہنچے ابا جی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ سیاسی حالات نے انھیں سخت پریشان کیا تھا۔ شاید یہی صدمہ اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ دوسرے دن یعنی ۱۶/اکتوبر کو لیاقت باغ میں جلسہ ہوا اور سڑکوں پر محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ اتفاق کی بات کہ انھیں محرابوں سے ابا جی کا جنازہ گزر رہا تھا۔ کوئی نعرہ نہیں لگ رہا تھا۔ لوگ خاموشی سے جنازے کے ساتھ چل رہے تھے۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رونے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

پروفیسر مرزا محمد منور (مقیم گلشن راوی لاہور) کی باتیں

پروفیسر مرزا محمد منور ان دنوں صاحب فراش تھے۔ لاہور میں اُن سے ملاقات ہوئی، انھوں نے ماضی کے واقعات کا یہ نقشہ کھینچا۔

۱۹۶۲ء میں الیکشن ہوئے۔ ان دنوں سکولوں اور کالجوں میں موسم بہار (اپریل) کی چھٹیاں تھیں۔ راجا صاحب نے کاغذات الیکشن کے لیے جمع کروائے تو کاغذات مسترد ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں سرکاری ملازمت سے برخاست کیا گیا تھا۔ میں حسن ابدال خورشید عاصم کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ حفیظ جالندھری بھی وہیں تھے۔ ہم نے پاکستان ٹائمز میں پڑھا کہ راجا حسن اختر کے کاغذات مسترد ہو گئے ہیں۔ ہم تینوں حسن ابدال سے راول پنڈی راجا صاحب کے گھر سٹلائٹ ٹاؤن آ گئے ہم نے کاغذات کے مسترد ہونے پر ان سے اظہار افسوس کیا۔ فرمانے لگے! ''فکر نہ کریں میں رٹ کروں گا۔ میرے حق میں قانون میں گنجائش موجود ہے۔ انشاء اللہ میرے حق میں فیصلہ ہوگا''۔ ہم ملاقات کے بعد واپس حسن ابدال چلے گئے۔ اگلے دن صبح اخبار میں آرڈیننس آ گیا جو راجا صاحب کے حق میں تھا اور ہونے کے بعد اتنی مدت پوری کر چکے تھے جتنی رکھی گئی تھی۔ اس آرڈیننس کی روشنی

میں اُن کے الیکشن میں حصہ لینے کے امکانات نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ایوب خان نے خاص طور پر یہ آرڈیننس راجا صاحب کے لیے جاری کیا ہے۔ کیوں کہ اور کوئی دوسرا سرکاری ملازم ایسا نظر نہیں آتا تھا۔ ہمیں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور ہم اگلے دن پھر راول پنڈی آ گئے اور اُن سے خوشی کا اظہار کیا۔ ہم نے خوب گپ شپ لگائی۔ راجا صاحب بہت خوش تھے۔ میں کہا! ''آپ کے سوا بر خاستگی کا کوئی اور معاملہ نہیں ہے اس لیے یہ آرڈیننس تو آپ ہی کے لیے جاری ہوا ہے''۔ کہنے لگے ''ٹھیک ہے'' میں نے کہا ''آپ کی پرانی دوستی ہے شاید؟'' جواب دیا ''ایوب خان فیروز پور چھاؤنی میں تھے اور میں بھی فیروز پور میں تعینات تھا۔ ہم وہاں کلب میں برج کھیلنے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ وہاں خوب ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یارانہ زیادہ نہیں تھا لیکن ایوب خان نے ان ملاقاتوں کا بھرم رکھا ہے اور آرڈیننس جاری کر دیا ہے۔

ہم نے بشیر احمد ارشد کو خبر لگانے کے لیے کہا تو انھوں نے جواب دیا! ''ہم ایوب خان و پسند نہیں کرتے کیوں کہ ہماری ہم دردیاں کونسل مسلم لیگ کے ساتھ ہیں ہم نہیں چاہتے کہ ایوب خان کا دستِ راست راجا حسن اختر آگے آئے اس لیے ہم یہ خبر نہیں چھاپتے''۔

آگے جو الیکشن آ رہے تھے ان میں کونسل مسلم لیگ نے محترمہ فاطمہ جناح کو اپنا امیدوار نام زد کر دیا۔ راجا صاحب کو معلوم ہوا کہ فاطمہ جناح کونسل مسلم لیگ کی امیدوار ہیں تو وہ بہت پریشان ہوئے ان کی عجیب حالت ہوگئی۔ وہ کنونشن مسلم لیگ کے صدر تھے جس نے ایوب خان کو اپنا امیدوار بنایا تھا۔ ایک طرف محترمہ فاطمہ جناح تھیں جن کو وہ ماں کہتے تھے۔ دوسری طرف ایوب خان تھے خصوصی توجہ اور رعایت سے راجا صاحب ایم این اے بنے تھے۔ وہ بہت پریشان تھے اور اکثر کہتے تھے کام بہت خراب ہو گیا ہے ذہن ایک طرف ہے اور ضمیر دوسری طرف۔

میں ایوب خان کے حق میں اور محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف کیا کہوں گا۔ محترمہ فاطمہ جناح میری ماں ہیں۔ میں بُری طرح پھنس گیا ہوں''۔ اس کشمکش نے اُن کے دل و دماغ پر ناخوش گوار اثرات مرتب کیے۔ وہ تناؤ کی کیفیت میں رہنے لگے۔ ایوب خان کے احسانات اور محترمہ فاطمہ جناح کے درجات میں سمجھتا ہوں کہ راجا صاحب کی موت کا سبب یہی پریشانی بنی۔

کنونشن مسلم لیگ کا صدر بننے کے بعد انھیں آرام تو ویسے بھی میسر نہیں ہوتا تھا۔ میں راجا صاحب کے پاس ملنے جاتا تو وہاں سیاسی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کنونشن مسلم لیگ کے سیاست دان ٹکٹ حاصل کرنے کی امید میں بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک بار میں ان سے ملنے گیا تو وہ اُٹھے اور مجھے گلے لگا لیا۔

فرمایا! ''آپ ٹھہریں میں ان کو ابھی فارغ کرتا ہوں پھر گپ شپ لگائیں گے''۔ میں نے کہا ''راجا صاحب یہ سیاسی چم چوں آپ کو مار دیں گے۔ یہ کہہ کر میں چل دیا''۔

جب وفات کی خبر ملی تو میں لاہور گورنمنٹ کالج میں پڑھاتا تھا۔ میں جب راول پنڈی پہنچا تو انھیں دفن کیا جا چکا تھا۔ پھر رسمِ قل پر پہنچا تو محمود نے دیکھ کر کہا! ''پروفیسر صاحب آج عاشق اقبال اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے''۔

میں نے علامہ اقبال کے کسی شعر کو بھی راجا صاحب سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور علامہ کے جو خاص موضوعات تھے اُن پر راجا صاحب نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔ لیکن وہ اکثر اقبال کی باتیں کرتے تھے اور کہتے تھے حضرت اقبال کی ایک خاص علمی اور دینی سطح ہے۔ میں چودہ سال اُن کی محافل میں بیٹھا ہوں۔ مجھے کبھی جرأت ہی نہیں ہوئی کہ میں کوئی علمی بحث چھیڑوں۔ میں اُن کی علمی گفت گو سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا۔ ملک عبدالعزیز ایڈووکیٹ اور راجا صاحب اقبال کے عاشق بل کہ مجذوب تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا جو اقبال سے اس

قدر متاثر ہو۔ اگر کوئی حضرت اقبال کے خلاف بات کرتا تو راجا صاحب برداشت نہ کر سکتے اور غصے سے کانپنے لگتے تھے۔ اگر کوئی ڈاکٹر اقبال کہتا تو فرماتے! ''حضرت علامہ اقبال کہا کرو''۔

علامہ کا شعر جو عام طور پر آٹو گراف میں لکھتے تھے وہ یہ تھا۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ است[۳۱]

ایک بار میں انے پوچھا! ''آپ کو کلام اقبال سے کیسے لگاؤ پیدا ہوا''، فرمایا ''مجھے اپنے والد بزرگ وار نے فرمایا تھا۔ ''مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا روم کے روپ میں اقبالؒ دنیا میں آئے ہیں''۔ اس زمانے میں اسرار خودی اور رموز بے خودی چھپ چکی تھیں۔ میں زیر تعلیم تھا۔ پھر جب ملازم ہوا تو لاہور، شیخوپورہ، فیروزپور اور گورداسپور میں رہا۔ اس صورت میں لاہور یا لاہور کے قریب رہا اور حضرت علامہ سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔

راجا حسن اختر مرحوم سے ایک بار میں نے پوچھا! ''کبھی آپ نے علامہ اقبالؒ سے کسی شعر کا مطلب پوچھا''۔ کہا ''مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ ایک دو بار میرے منہ سے علامہ کے پاس بیٹھنے والوں کے متعلق بات نکل گئی۔ میں نے عرض کیا حضرت، مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر آپ کی محفل میں بیٹھتے ہیں اور ظاہراً آپ پر فدا ہوتے ہیں اور اُن کی زبانیں آپ کو احترام میں چلتی ہیں۔ اور وہ جب یہاں سے اُٹھ کر جاتے ہیں تو آپ کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ جواب میں حضرت علامہ نے فرمایا! ''اختر یہ بڑے مخلص منافق ہیں''۔

راجا حسن اختر کو جن شاعروں سے لگاؤ تھا دراصل وہ اقبالؒ کے پسندیدہ شعراء تھے۔ یہ شعراء عرفی، بیدل اور مولانا روم تھے۔ مولانا روم سب سے زیادہ پھر بیدل اور پھر عرفی انھیں پسند تھے۔ راجا صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں مرزا عبدالقادر

بیدل کا انتخاب کروں۔ یہ فرمائش راجا حامد مختار اور پھر یہی فرمائش سلطان مقصود نے کی۔ میں نے انتخاب کیا اور پانچ چھ ہزار شعر اپنے قلم سے لکھے اور راجا صاحب کو دکھائے۔ وہ خوش ہوئے اپنا تھیلا نکالا اور کہا! ''اس میں رکھو یہ مسودہ محفوظ ہوگا اور چھپ جائے گا۔لیکن وقت گزرتا گیا اور کتاب نہ چھپ سکی اور وہ تھیلا اسی طرح پڑا رہا۔پھر راجا صاحب فوت ہوگئے۔حامد مختار بھی فوت ہوگئے اور سلطان مقصود بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔خیال آیا تو تھیلے کو تلاش کیا گیا۔اس کو دیمک چاٹ گئی تھی۔ دوسرے کاغذ اس کے تقریباً محفوظ تھے اور کلام بیدل دیمک نے کھالیا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ دیمک بیدل شناس تھی جیسے کسی کا کہنا ہے۔

ماہی تیرا گھٹ بھر جاں

مینوں ویکھیاں چین نہ آوے

مجھے کبھی راجا صاحب نے خود بخود حضرت علامہ کا کوئی شعر سمجھانے کی کوشش نہیں کی البتہ باتوں میں شعر سنا دیا کرتے تھے۔ میں نے کئی بار اُن سے کہا ''راجا صاحب آپ نے حضرت علامہ سے خود کسی شعر کا مطلب کیوں نہیں پوچھا؟ تو جواب ملتا 'ایک تو مجھے ایسی جرأت نہیں ہوتی تھی، دوم یہ کہ حضرت علامہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خود اپنے شعروں کا مفہوم بیان کریں۔علامہ اقبال فرماتے تھے شعر پڑھنے والے کی سمجھ کے مطابق ہونا چاہیے اور اس کو اپنی علمی سطح اور رجحان کے مطابق لطف لینا چاہیے۔

میں نے یوسف سلیم چشتی کو کئی بار کہتے سنا ''میں نے علامہ اقبال سے اسرار و رموز سبقاً سبقاً پڑھی''۔ یہ بات کہاں تک سچ ہے وہی جانیں۔ مجھے انھوں نے کئی رجسٹر دکھائے جن میں علامہ اقبال کے کئی اشعار کے معانی درج تھے اور یوسف سلیم چشتی کے مطابق وہ معانی خود علامہ نے املا کروائے تھے۔ایسے کئی رجسٹر یوسف سلیم چشتی کے پاس تھے۔خدا جانے وہ رجسٹر ان کی وفات کے بعد اب کس کے پاس

ہیں۔

میں نے راجا صاحب کو فقط ایک بار دیکھا کہ اس حال میں انھوں نے ایک دو الفاظ کے معانی کی وضاحت کسی سے چاہی مثلاً مئی ۱۹۵۷ء میں وہ لائل پور گورنمنٹ کالج میں بسلسلہ یوم اقبال آئے۔ جلسے سے پہلے سٹاف روم میں ہمارے پاس بیٹھے۔ میں اس وقت اس کالج میں تھا۔ وہاں ان کا تعارف کروایا گیا۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی بھی وہاں موجود تھے وہ اردو پڑھاتے تھے اور انھوں نے علامہ اقبالؒ پر علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ تلمیحات اقبالؒ ان کا موضوع تھا۔ راجا نے اُن سے پوچھا جاوید نامہ میں ''جہاں دوست'' جن کردار کا نام ہے وہ ہندو بزرگ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آپ بتائیں کہ ان کا اصلی نام کیا ہے؟'' اکبر قریشی نے جواب دیا ''وشوامتر'' راجا نے فرمایا ''بالکل ٹھیک ہے یہی نام ہے''۔

مجھے اقبالیات کی دنیا میں جو شہرت نصیب ہوئی اس کا سبب راجا تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے لائل پور سے بلوا کر مرکزیہ مجلس اقبال کے سٹیج پر تقریر کرنے کا حکم دیا۔ میرا مجلس اقبال سے اس طرح رابطہ ہوا اور لاہوریوں نے مجھے اقبالی نیازمند کے طور پر دیکھا۔ اُس زمانے میں اقبال اکادمی کراچی میں تھی۔ ۱۹۶۴ء میں راجا صاحب کو ایوب خان نے اقبال اکادمی پاکستان کی مجلس حاکمہ (گورننگ باڈی) کا رکن بنا دیا۔ ۱۹۶۳ء میں یوم اقبال کے سلسلے میں ڈائریکٹر اقبال اکادمی نے راجا سے مقررین کا نام مانگے۔ راجا صاحب نے مجھ سے پوچھے بغیر میرا نام دے دیا اور ان سے کہا باقی آپ جسے چاہیں بلوالیں مگر لاہور سے صرف ایک آدمی ہوگا اور وہ مرزا منور ہے۔ لاہور سے کوئی اور نام نہیں'' ستمبر ۱۹۶۱ء میں، میں گورنمنٹ کالج لاہور میں آیا تھا اور اس طرح راجا صاحب کی مہربانی سے اقبال اکادمی سے میرا تعلق قائم ہوا جہاں میں نے ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء اور شاید ایک آدھ بار بعد میں خطاب کیا۔ ۱۹۷۵ء میں اقبال اکادمی کراچی سے لاہور آ گئی۔ اقبالؒ کے نام پر سندھ میں

ایک ہی ادارہ تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے سندھ سے لاہور منتقل کر دیا۔ اقبال اکادمی مرکزی مجلس اقبال اور اہل علم و ادب نے مجھے اس توسط سے پہچانا اور رہوتے ہوتے میں اقبالی دنیا میں ایک چھوٹا سا پھنے خان بن گیا اور یہ سب راجا حسن اختر کی عنایت ہے۔

جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں۔

میں راجا صاحب مرحوم کا سرتا پا شکر گزار ہوں۔ میری اُن سے تقریباً ساڑھے سات سال رفاقت رہی۔

رانا اکرام علی کا کہنا ہے

(رانا اکرام علی کوہستان اور نوائے وقت لاہور سے منسلک رہے پھر ذاتی اخبار جلوہ داں ہفت استقلال اور ثالث جاری کیے)

راجا حسن اختر کی اقبال سے قلبی وابستگی تھی۔ وہ جس زمانے میں وکیل تھے لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ اگر اُن کا کوئی مقدمہ چل رہا تھا اور کسی نے اقبال کے شعر کا مطلب پوچھ لیا تو وہ مقدمہ بھول گئے اور اقبال کے شعر کی تشریح کرنے لگے۔ اب تقریر جاری ہے اور سننے والا کہہ رہا ہے۔ ''میں سمجھ گیا'' لیکن جب تک انھیں اطمینان نہیں ہو جاتا وہ بولے جا رہے ہیں۔

میں ان کی بیٹی کو پڑھایا کرتا تھا۔ میں اس وقت ایم اے فلاسفی کر رہا تھا۔ اگر میرے ہوتے ہوئے راجا صاحب گھر آ جاتے تو پھر بچوں کو چھٹی۔ راجا صاحب کی گفت گو شروع ہو گئی اور وہ مختلف موضوعات پر بول رہے ہیں۔ راجا صاحب کی خواہش تھی کہ مغربی مفکرین کی جو آرا ءآنحضور ﷺ کے متعلق ہیں وہ جمع کی جائیں۔ یہ تحریک انھیں حضرت علامہ اقبالؒ سے ملی تھی۔

ایک دن راجا صاحب نے بتایا ''سالک اور مہر حضرت اقبال کے پاس آتے تھے۔ وہ انقلاب نکالتے تھے۔ غلام مرتضیٰ احمد خان میکش، چراغ حسن حسرت اور

ان کا روزنامہ احسان مسلم لیگ اور اقبال کے نظریات کے حامی تھے۔ایک دن میں نے حضرت علامہ سے پوچھا یہ سالک اور مہر آپ کے پاس آتے ہیں اور اکثر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ آپ کے نظریات کے خلاف ہیں۔تو حضرت علامہ اقبال نے جواب دیا ''کیا کریں بے چارے مخلص منافق ہیں۔''سید نذیر نیازی کی کتاب اقبال کے حضور میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے۔

راجا صاحب کا خیال تھا کہ علامہ اقبال ن اسلامی مملکت کا جو تصور دیا وہ دراصل ایک مملکت کا تصور نہیں تھا بل کہ دنیائے اسلام کو متحد کرنے اور اس کے دفاع کا ذریعہ بنانے کا تصور تھا۔راجا صاحب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ چلتا پھرتا کلام اقبال تھا۔

اُن کی یہ پختہ عادت تھی کہ جو بات کرتے تھے اس پر عمل کرتے تھے۔میں نے ایک بار ڈی سی شیخوپورہ کے لیے سفارش کروائی اور ایک آدمی کو رقعہ لے کر دیا۔ہفتے بعد مجھ سے پوچھا۔''اکرام صاحب میرے رقعہ کا کیا بنا؟''میں نے جواب دیا کہ ''وہ آدمی آیا نہیں اور عموماً یہ ہوتا ہے کہ اگر کام ہو جائے تو لوگ واپس نہیں آتے اور اگر کام نہ ہو تو ضرور آتے ہیں۔وہ نہیں آیا اس لیے کام ہو گیا ہوگا۔'فرمایا ''مجھے پتہ تو چلنا چاہیے کہ میرے رقعہ کا کیا ہوا؟'' ایسے معاملات کو بھولتے نہیں تھے۔راجا صاحب بہت بھلکڑ آدمی تھے۔جسے نہیں بھولتے تھے وہ صرف کلام اقبال تھا یا علامہ کے ارشادات اور ان کے پاس حاضری دینے کے اوقات تھے۔باقی تمام معاملات میں بھلکڑ تھے۔

وہ کلام اقبال سے بہت متاثر تھے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اقبالؒ کے کلام کا حوالہ دیتے تھے اور اکثر لوگوں کو بھی اقبالؒ کے شعر سناتے اور ان کی تشریح بتاتے تھے۔کلام اقبال سے انھیں محبت نہیں بلکہ عشق تھا۔جو لوگ کلام اقبال سے محبت رکھتے تھے راجا صاحب انھیں دل و جان سے چاہتے تھے۔مرزا منور صاحب

سے بھی محبت کا یہی سبب تیا۔ میری اُن سے پہلی ملاقات فیصل آباد میں ہوئی جب وہ یوم اقبال کے حوالے سے لیکچر کے لیے وہاں تشریف لائے۔ یہ واقعہ غالباً ۱۹۵۷ء کا ہے۔ اس کے بعد لاہور میں ان کے بچوں کو پڑھاتا رہا۔ اُس وقت وہ افغانی روڈ سمن آباد رہائش پذیر تھے۔ میں دو سال تک اُن کے بچوں کا اتالیق رہا۔ یہ غالباً ۶۲،۶۱ ۱۹ء کا عرصہ ہے۔ اس کے بعد میرا اُن سے تعلق نہ رہا کیوں کہ وہ سیاست میں چلے گئے اور میں گوشہ نشین تھا۔ اُس وقت صرف کتابیں پڑھنا میرا شغل تھا۔ وہ کلام اقبال کو ہر جگہ سنانے کا موقع تلاش کرتے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ کوئی محفل ہو۔ راجا صاحب اس میں موجود ہوں اور کلام اقبال نہ سنایا جائے۔

حوالے

۱۔ محمود اختر کیانی، مرا شہید بھائی، ص ۵۹۔

۲۔ یہ اشعار راجا حسن اختر کی آخری آرام گاہ کے سنگ لحد پر ہیں اور اُن کے گھر کھوٹہ میں اُن کے بیٹے سلطان ظہور اختر نے فریم کروا کر دیوار کے ساتھ لگا رکھے ہیں۔

۳۔ حسن آفاقی، سطان ظہور اختر، ص ۳۱۔

۴۔ حسن آفاقی، سطان ظہور اختر، ص ۳۱۔

۵۔ ظہور اختر، حسن آفاقی، ص ۷۲۔

۶۔ ایضاً

۷۔ ظہور اختر، حسن آفاقی، ص ۱۲۷۔

۸۔ حسن اختر کیانی، ایک سپاہی ایک شاعر، راول پنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۴ء، ص ۱۲۴۔

۹۔ ظہور اختر، حسن آفاقی، ص ۱۶۱۔

۱۰۔ کلیات اقبال (فارسی)، ص ۸۹۴/۱۲۔

۱۱۔ راجا محمد زر سابق چیئر مین یونین کونسل، سابق ممبر حرگہ، سابق ممبر ڈویژنل کونسل، سابق ڈائریکٹر کواپریٹو بنک

۱۲۔ ایڈووکیٹ (ایم۔ایل۔اے)

۱۳۔ راجا حسن اختر کے بیٹے بیٹیوں کے نام محمود اختر، خالدہ اور عابدہ ہیں۔ اسی طرح مرزا اللہ دتہ کے بیٹے بیٹیوں کے نام محمود اختر، خالدہ اور عابدہ ہیں۔

۱۴۔ مرزا محمد صادق کے بیٹوں کے نام محمد اقبال اور جاوید اقبال ہیں۔ یہ اُسی قربت اور عقیدت کا نتیجہ ہے جو ان کو علامہ اقبال سے تھی۔ یہ عقیدت راجا حسن اختر کے وسیلے سے تھی۔

۱۵۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۸۴/۶۰

۱۶۔ مرزا مغفور احمد ساکن منیاندہ تحصیل کہوٹہ ضلع راول پنڈی۔

۱۷۔ یہ بات چودھری علی اصغر نے اپنی گفتگو میں سنائی۔

۱۸۔ تصدیق بیان راجا محمد زر۔

۱۹۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص۱۸۶/۱۷۰۔

۲۰۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص۴۴۸/۱۲۲۔

۲۱۔ ایضاً، ص۴۹۵/۱۷۱۔

۲۲۔ تصدیق بیان پروفیسر عابدہ احسان دختر راجا حسن اختر۔

۲۳۔ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ۲۴۱/۲۲۵۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۸۶/۱۷۰۔

۲۵۔ ایضاً، ص۳۶۷/۴۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص۴۷۷/۱۵۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص۴۹۵/۱۷۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص۴۸۶/۱۶۲۔

۲۹۔ تصدیق بیان طاہرہ کیانی دختر راجا حسن اختر۔

۳۰۔ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، ص۱۹/۱۹۔

باب چہارم

راجہ حسن اختر کے مکاتیب

- حمید نظامی کی وفات پر لکھا ہوا خط
- کرنل ظہور کے نام سفارشی خط
- ظہوری اور سودی کے نام خط
- قومی اسمبلی کے انتخاب کے لیے عوام کے نام خط
- میجر ظہور اختر کے نام خط
- ایک انگریزی خط کا ترجمہ
- ہوائی جہاز سے لکھا گیا ایک خط

IqbalCyberLibrary All rights reserved. ©2006

راجا حسن اختر کے مکاتیب

ا۔ گزارش

باب کی شروعات درج ذیل اقتباسات سے کی جائے۔

شکریہ!

اگر ہم اپنے شعرا و ادبا کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ غالب سے اقبال تک ہمارے شعراء و ادبا کی کاوشوں و مساعی نے علم و ادب کی جو دنیا آباد کی ہے، اُس کی رونق، آب وتاب اور جلوہ گری، میں مکاتیب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔

مکاتیب کی روشنی میں ہمیں صاحبِ فن کی خارجی اور داخلی شخصیت کی، اس کے جسم و جان کی، اُس کے قلب و ذہن کی اور اکثر اوقات اُس کی مضطرب روح کی ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے کہ اُس تصویر کے سہارے ہمیں بات کہنے والے کی بات تک پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے اور اس کے گرد و پیش کی زندگی کا مفہوم سمجھنے میں بھی۔

اب تک ہم غالب، سرسید، نذیر احمد، شبلی اور اکبر کے خطوں کی روشنی میں اُن کے کاتب کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں۔ اور اس کوشش میں جہاں ایک طرف یہ نتیجہ نکالنے میں کامیاب ہوئے کہ علمی، ادبی اور قومی و تہذیبی زندگی کے ان اکابر نے ہمیں اپنے مکاتیب کے ذریعے اپنے متعلق اور اپنے عہد کے متعلق جو کچھ بتایا ہے، اُس سے ہم پر زندگی کے بہت سے بھید کھلے اور بہت سے اسرار و رموز منکشف ہوئے ہیں۔

لیکن دوسری طرف ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ان خطوں میں سے ہر ایک کے خط میں ایک نمایاں انفرادیت بھی ہے اور وہی انفرادیت ان شعرا و اُدبا کا طغرائے امتیاز ہے۔ غالب کے خطوں کا گہرا شخص اور تہذیبی رنگ، سرسید کا بے مثال قومی

تشخص، نذیر احمد کی مقصدیت و مدعا نگاری، شبلی کی رومانی شیفتگی اور اکبر کی افسردہ دلی ان شعرا و اُدبا و صلحا کی منفرد اور ممتاز شخصیتوں کا عکس ہے۔

یہی صورت حال راجا حسن اختر کے مکاتیب کی بھی ہے۔ راجا حسن اختر کے مکاتیب، ان کی شخصیت کی متنوع جہات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

راجا حسن اختر کی احباب سے وابستگی، اولاد سے شفقت اور اقبال سے عقیدت کا عکس ہمیں ان کے مکاتیب میں بھی واضح نظر آتا ہے۔ راجا حسن اختر کے مکاتیب کو اگر بہ نظرِ غائر و تعمق پڑھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ راجا حسن اختر کے مکاتیب سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

اُن کا اندازِ تحریر تصنع، ریاکاری اور ذو معنویت سے مبرّا ہے۔ وہ اپنے دل کی بات کو انتہائی شُستہ اور صاف لفظوں میں بیان کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے مکاتیب میں شگفتگی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔

ذیل میں دیا گیا ایک خط ملاحظہ فرمائیں جو انھوں نے حمید نظامی کی وفات پر اپنے بیٹے کرنل ظہور کو لکھا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ حمید نظامی سے راجا حسن اختر کو کس قدر محبت تھی۔

حمید نظامی بلاشبہ ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھی۔ راجا حسن اختر کا ان کی وفات پر اپنے بیٹے کو یہ کہنا کہ:

ان کی وفات پر اتنا صدمہ ہوا کہ والدہ مرحومہ کی وفات پر بھی ہوا تھا۔۔۔۔۔

بالکل بجا ہے۔

چوں کہ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ حمید نظامی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت اسی غیر معمولی عقیدت اور احترام کی مستحق ہے۔

ایڈیٹر نوائے وقت حمید نظامی کی وفات پر ۱۹۶۲ء۔۳۔ا کو راجا حسن اختر نے اپنے بیٹے کرنل ظہور اختر کو ایک خط لکھا!

پیارے بیٹے، السلام علیکم!

تم نے اخبارات میں پڑھ لیا ہوگا کہ تمھارے چچا حمید نظامی اس جہان فانی سے عالمِ جاوداں کو رخصت ہو گیا ہے۔ ملک کے بہترین ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے علاج کی نگرانی کی لیکن دریائے مشیت کے سامنے ان سب انسانی کوششوں کی حیثیت ایک کم زور تنکے سے زیادہ نہ تھی۔ ۲۳ تاریخ سحری کے وقت ایک چائے کا پیالہ پیا اور دورۂ قلب کا حملہ ہوا۔ ۲۳ دن رات اور ۲۴ دن رات سخت مصیبت اور اذیت میں گزرے ۲۵ بہ روز اتوار ۱۹۶۸ء ۱۱ بجے دن مرحوم نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ۲۶ تاریخ بہ روز سوموار پچاس ہزار آدمیوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی۔ یونی ورسٹی کے کالج اور سکول بند کر دیے گئے۔ ۲۷ تاریخ رسمِ قل بھی ادا ہو گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ میرے لیے یہ حادثہ اور یہ مرگ ناگہاں قربِ قیامت سے کم نہیں۔ مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ والدہ مرحومہ کی وفات پر بھی نہ ہوا تھا۔ چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔

مجھے یہ خیال تسکین دیتا ہے تھا کہ میرے بعد میرے بچوں کی راہ نمائی اور ہدایت کے لیے نظامی جیسا مردِ مومن اور مردِ امین موجود ہے۔ یہ کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ وہ اس عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گا۔

تمھارا ابا

راجا حسن اختر بہت ملنسار تھے۔ وہ لوگوں کے ساتھ بڑے خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اُن کو لوگوں کی بڑی فکر رہتی تھی۔

اپنے بیٹوں سے وہ حد درجہ پیار کرتے تھے ہی مگر اُن کا یہ پیار، مہربانی اور شفقت سے بھرا جذبہ صرف اپنے بیٹوں تک محدود نہ تھا۔ بل کہ وہ عام لوگوں سے بھی یہی جذبہ روا رکھتے تھے۔

ایک خط ملاحظہ فرمائیں؛ جو انھوں نے اپنے بیٹے کرنل ظہور کو لکھا۔ آپ کو پتا

چلے گا کہ وہ اپنے ایک پرانے تعلق دار کپتان خان بہادر صاحب کی کس طرح سفارش کرتے ہیں۔ اُس کی خیر خواہی کے لیے اپنے بیٹے کو تاکید کرنا اور پھر اُسے گھر کا فرد قرار دینا، یہ اُن کے بے لوث محبت نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

۶۱۔۸۔۲۶ کو راجہ صاحب نے اپنے بیٹے کرنل ظہور کو ایک سفارشی خط لکھا!

ظہوری۔ السلام علیکم!

۱۔ میں والدہ مرحومہ کی برسی کے لیے گھر آیا ہوا ہوں۔ سودی نزدیک تھا اسے اطلاع دی کہ ایک دن کے لیے وہ بھی آ جائے لیکن وہ نہیں آیا۔ معلوم نہیں چھٹی نہیں ملی یا کیا وجہ ہے۔ وہ آج کل مجھ سے سخت ناراض ہیں اس لیے کہ میں ایک معیاری آدمی نہیں۔

۲۔ اس وقت کپتان بہادر صاحب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ یہ نہایت ہی نیک اور شریف بزرگ ہیں اور مجھے ان کی بڑی قدر ہے۔ ہمارے پرانے تعلق دار ہیں۔ ان کا صاحبزادہ محمد اختر وہاں تمھارے ساتھ لیفٹیننٹ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اس کی تربیت کرو گے تاکہ یہ دنیا میں کامیاب ہو اور ترقی کرے۔ یہ بالکل اپنے گھر کا لڑکا ہے۔ اور تمھارا بھائی ہے۔

دعا گو،

تمھارا ابا

مکتوب نگاری ایک فن ہے۔ خط لکھنے کا انداز نہایت چستہ اور برجستہ ہونا چاہیے۔ تاکہ خط میں کہی ہوئی بات فوری طور پر سمجھ میں آ جائے۔

لمبے چوڑے القابات اور تسلیمات سے گریز کرنا چاہیے۔ خط نصف ملاقات کا درجہ رکھتے ہیں۔ خط لکھنے والے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے۔ کہ انداز بیان میں سادگی و سلاست پیدا کی جائے تاکہ مدعا نگاری کی رسائی بہ آسانی ممکن ہو سکے۔

راجا حسن اختر کی علمیت اور قابلیت پر کوئی کلام نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے

مکاتیب میں مشکل الفاظ، مبالغہ آرائی، ذومعنونیت اور تصنع کو استعمال میں نہیں لاتے۔

ذیل میں اُن کے دو خطوط دیئے جاتے ہیں، جو کہ انھوں نے اپنے بیٹوں ظہوری اور سعودی کے نام لکھیں۔ ان خطوط سے اندازہ ہوا جاتا ہے کہ وہ کس طرح نہایت بے تکلف انداز میں اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہیں اور پھر کس طرح خط کے اختتام پر اپنی نسبت ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

ظہوری، السلام علیکم! ابتدا

تمھارا ابا اختتام

وہی بے تکلفانہ انداز جو ایک بیٹے اور باپ کے درمیان ہو سکتا ہے۔ پھر سعودی والا خط ملاحظہ فرمائیں۔ ایک ایک جملے سے باپ بیٹے کی محبت بھری ادائیں چھلکتی نظر آئیں گی۔

چک نمبر۔۱۰۰ تحصیل منٹگمری سے اپنے بھتیجے کی وفات پر اپنے بیٹے سلطان ظہور کو یہ خط لکھا۔

ظہوری، السلام علیکم!

۳۰ تاریخ اڑھائی بجے رات مجھے اطلاع ملی کہ میرے بھائی مرحوم کا نشان میرا بھتیجا راجا غلام صفدر اس جہانِ فانی سے رحلت کر گیا ہے۔ ۳۱ کی صبح میں یہاں پہنچ گیا اور یہاں ہی عزیز مرحوم کو سپرد خاک کیا۔ کل رسمِ قل (قرآن خوانی) ہے۔ اور میں پھر واپس لاہور چلا جاؤں گا۔

جنازہ میں سلطان مقرب، شیر احمد، ممتاز، صوبے دار زرداد، راج گان چک نمبر ۵ یعنی علی ہیبت خان، خان ملک خان، یعقوب وغیرہ شریک ہو گئے تھے۔ آج میجر اقبال صاحب بھی آ گئے تھے۔

مرزا اللہ دتہ صاحب کو اطلاع نہ دے سکا۔ کل رسم قل میں شرکت کے لیے انھیں اطلاع دے دی گئی ہے۔

مسعود کو بھی آج وفات کی اطلاع دے رہا ہوں۔ صفدر مرحوم نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے چچا کے ادب اور پاس داری کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں توفیق دے اور اس کی تمام اولاد بچوں اور بچیوں کی خیر خواہی کرو۔

علی اصغر چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ سلطان خان دبیرن گیا ہوا ہے اس لیے والد کا چہرہ دیکھ سکا۔ آج اس کا انتظار ہے۔

کل مَن علیھان

انا لِلّٰہِ و انّا الیہِ راجعون

تمھارا ابا، حسن اختر

اپنے بیٹے میجر مسعود اختر شہید کو یہ خط ۵۳۔۸۔۱۱ کو لکھا۔

سودی جان، السلام علیکم!

ابا کی کامیابی پر تمھیں مبارک ہو، اب بتاؤ ابا کو کیا انعام دو گے؟ انعام کیے بغیر میں چپ نہیں ہوں گا۔ خدا کی شان ہے کہ اب تک مجھے کسی نے انعام دینے کی طرف توجہ نہیں کی۔ مجھے بالکل عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ تمھارے بہن بھائیوں میں سے ایک ایک سے میں انعام لوں گا۔ ورنہ سخت ناراض ہو جاؤں گا۔

آپ کا دعا گو،

ابا

راجا حسن اختر انتہائی مخلص اور مہربان شخص تھے۔ انھوں نے حتی الامکان لوگوں سیاسی اور سماجی خدمت بھی کی۔ انھی خدمات کا عوض وہ لوگوں کے ہر دل عزیز شخص بن گئے۔

ایک خط جو انھوں نے سیاسی غرض و غایت سے لکھا۔ اس خط میں انھوں نے

بڑی راست گوئی اور بے باکی کے ساتھ معاشرے میں پنپتی ہوئی برائیوں کا ذکر کیا۔

اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو اپنا نمایندہ منتخب کرنے کا شعور بھی دیا۔ گو کہ یہ خط راجا حسن اختر نے اپنے مقصد کے لیے لکھا۔ مگر انھوں نے سیاست میں نہ ہوتے ہوئے بھی عوام کی جو خدمت کی، وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

بل کہ اگر یہ کہا جائے کہ راجا حسن اختر نے خدمتِ خلق کے اسی جذبے کے تحت سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو بے جا نہ ہوگا۔

راجا حسن اختر نے ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا اور لوگوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے یہ خط اپنے علاقہ کے عوام کو بھیجا۔

مکرمی و محترمی، السلام علیکم!

میں نے اللہ تعالٰی کے فضل و کرم پر بھروسا کرتے ہوئے مرکزی اسمبلی کی نشست راول پنڈی۔ ا کے انتخاب میں حصہ لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

موجودہ انتخابات مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر نہایت ہی اہم ہیں۔

اوّل:۔ نیا آئین نافذ ہو چکا ہے اور اس امر کی ضرورت کہ راستی اور دیانت داری سے اسے قومی زندگی کے تار و پود میں داخل کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے تاکہ اس کا بھی وہی حشر نہ ہو جو پہلے آئین کا ہوا ہے۔

دوم:۔ جن قوتوں اور عوامل نے پہلے آئین پر عمل نہیں ہونے دیا وہ اب بھی زندہ ہیں اور ان سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ آئین کے راستا میں رکاوٹیں نہیں ڈالیں گے۔

سوم:۔ قائد اعظم نے ہمارے قومی کردار کی تعمیر مندرجہ ذیل سہ گانہ اصول پر رکھی تھی۔ ۱۔ Faith (ایمان) ۲۔ Unity (اتحاد) ۳۔ Discipline (نظم) ان تینوں اصولوں کی بے حرمتی بر سرِ بازار ہو رہی ہے اور نوعمر طلبہ تک کو فتنہ فساد کا آلہ کار بنانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

چہارم :۔ پاکستان اندرونی اور بیرونی اعلانیہ اور خفیہ دشمنوں اور بدخواہوں کی زد میں ہے۔

اندریں حالات موجودہ انتخابات کی اہمیت ظاہر ہے اور رائے دہندگان پر قومی اور اخلاقی ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا نمائندہ منتخب کرتے وقت اس بات کو مدنظر رکھیں کہ ان کا نمائندہ ملت اسلامیہ اور پاکستان کا پورا وفادار ہے اور اس میں اتنی قابلیت اور صلاحیت ہے کہ وہ موجودہ آئین کو قومی اور ملکی مزاج کے مطابق بنانے کی کوشش کرے اور پوری تندہی اور بے خوفی اور دیانت داری سے اسمبلی کے اندر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

میری قومی زندگی کے حالات تحریک پاکستان کی ابتدا سے لے کر اب تک پوری طرح آپ پر واضح ہیں۔ میں اسی لازوال مقصد کے پیش نظر مصمم ارادہ کر چکا ہوں کہ اس نازک وقت میں موجودہ آئین کے تحت انتخاب میں حصہ لوں اور قومی زندگی کی تعمیر کے لیے سعی کروں۔

لہٰذا میں آپ سے توقع رکھتا ہوں کہ اگر آپ محسوس کریں کہ میں قوم اور ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہوں تو اس انتخاب میں میرے ساتھ دلی تعاون فرمائیں اور اپنے نیک مشوروں سے مستفید فرمائیں۔

والسلام

آپ کا دعا طلب

حسن اختر۔

راجا حسن اختر کو علامہ محمد اقبال سے بہت زیادہ عقیدت تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اقبال کے اشعار سُنا دینا اور پھر افکارِ اقبال کی وساطت سے اپنے مافی الضمیر کا مدعا پیش کرنا اُن کا وتیرہ تو تھا ہی مگر وہ تحریروں میں بھی کلام اقبال کا حوالہ دیئے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

راجا صاحب کو اپنے بچوں اور بچیوں سے بہت محبت تھی۔ وہ اپنے بیٹے ظہور اختر کو خط لکھتے ہیں ظہور اختر اُس وقت میجر تھے اور ریاست سوات میں تعینات تھے۔ اُن کے بیٹے تیمور (جسے راجا صاحب پیار سے تمی کہتے تھے) کو راجا صاحب نے پیار کیا تو اُس نے اُن کی ناک کھینچی۔ راجا صاحب نے ظہور اختر کو یہ لکھا!

میں تمی کی شکایت کرنا بھول گیا۔ اُس نے کل میرا ناک کھینچا تھا۔ یہ شکایت میں نے اُسے سنا بھی دی ہے۔ (یہ راجا صاحب کے اصلی الفاظ ہیں)

ایک بار راجا صاحب نے ہوائی سفر کرتے ہوئے سلطان ظہور اختر کو ایک مختصر خط لکھا جو ایک کارڈ تھا۔ وہ اپنے سفر اور قیام کے بارے میں لکھ کر آخر میں یہ شعر لکھتے ہیں۔

نگاہ بلند سخن دل نواز جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

اہل دانش نے سچ کہا ہے کہ: ''بڑے لوگوں کے انداز بھی بڑے ہوتے ہیں۔'' مثال کے لیے راجا حسن اختر کا ایک خط ملاحظہ فرمائیں۔

باتوں ہی باتوں میں راجا حسن اختر متصوفانہ، محققانہ اور ماہرانہ مشورے دیئے جاتے ہیں اور کہتے ہیں:

''مجھے کچھ زیادہ نہیں پتا''

یہ اُن کی عاجزی ہے جو بڑوں کی سرشت وطنیت کا خاصہ بن جاتی ہے۔ یہی تو بڑا اپن ہوتا ہے۔

ایک انگریزی خط کا ترجمہ

میرے پیارے گلزار۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ ہم ایک دوسرے سے لاہور نہ مل سکے۔ آج میں خیر خواہوں کے ایک گروہ میں بیٹھا ہوا ہوں جہاں آپ کی کتاب پر بحث ہو رہی

ہے۔ میں اس کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا اس لیے اس کے متعلق اُن سے زیادہ بات نہ کر سکا۔ کچھ دوستوں کی تجویز ہے کہ آپ کو گورڈن کالج کے پروفیسر اعظم سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اُن میں آپ کے مضمون کے حوالے سے ایک تاریخ دان کی دلچسپی دکھائی دیتی ہے۔ اور ۔۔۔ میری اطلاع کے مطابق ۔۔۔ وہ قابلیت کے مالک ہیں۔

چھپر شریف ضلع جہلم کے پیر صاحب کے مطابق مرزا سجاول خان جن کا مقبرہ کہوٹہ میں ہے اور جن کو سخی مرزا سائیں کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ ایک گکھڑ ہیں۔ چھپر شریف کے بزرگ درویش حضرت صاحب کا تعلق اس خاندان سے ہے جو سخی مرزا سائیں کے خلفاء تھے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ راول پنڈی کے حضرت چن چراغ جو کہ اس دور کے ایک بہت بڑے درویش تھے وہ بھی سخی مرزا سائیں کے خلیفہ تھے۔ حضرت دو دہا مرد حقانی جن کا مقبرہ دانگلی میں ہے وہ بھی ایک گکھڑ ہیں۔ وہ سیون شریف (سندھ) کے سخی شہباز قلندر کے پہلے خلیفہ تھے۔ درکالی معموری کے حضرت بگا شیر بھی ایک گکھڑ تھے۔ آپ کا خاندانی تاریخ کا کام بڑی تحقیق اور دلچسپی کا معاملہ ہے۔ شاہ جیونہ کے سید، سید مبارک شاہ وغیرہ آپ کو مرد حقانی کے متعلق معلومات فراہم کر سکتے ہیں کیوں کہ اُن کے آباواجداد اُن کے خلفاء تھے۔

آپ کا موضوع بہت نازک ہے۔ میں نے سُنا کہ خان پور کے کچھ لوگ اس کو پھروالہ کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کہتے ہیں ۔۔۔ میں نے گلزار کی کتاب پڑھنے کی کوشش کی ہے لیکن ناکام رہا۔ مجھے یہ کتاب پڑھنی چاہیے۔

محبت کے ساتھ

آپ کا

حسن اختر ۵۲۔۹۔۱۰

راجا حسن اختر کے خطوط سے اُن کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے۔

راجا حسن اختر حضرت علامہ محمد اقبال اور کلام اقبال کے فریفتہ تھے۔ وہ اپنے خطوط میں اقبال کے اشعار اس شُستگی و برجستگی سے لاتے ہیں کہ تحریر میں کہیں بھی سقم نہیں آتا۔ بل کہ تحریر کی سادگی و سلاست میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر اُن کی ہلکی پھلکی تحریر ایک نادر و نایاب فن پارہ بن جاتی ہے۔

اقبال کے اشعار راجا حسن اختر کے مکاتیب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگر ان کو نکال دیا جائے تو دل کی بات ادھوری رہ جاتی ہے۔

آخر میں ایک اور ہلکا پھلکا خط ملاحظہ فرمائیں:

ہوائی جہاز سے لکھا گیا ایک خط

ظہوری السلام علیکم!

آج ۶۴۔۹۔۲۵ کے دن ۱۲ بجے پہنچ جاؤں گا۔ انشاء اللہ۔ دو دن برلن ٹھہرنا ہے۔

اللہ تعالی تمھاری باجی اور سب بچوں کو دو جہان کی رحمتیں ارزانی فرمائے۔

نگاہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

تمھارا ابا

باب چہارم

راجہ حسن اختر کی تنقید اقبالیات

- شاعرِ ربانی
- مسلک وفا
- مردِ حق
- بارگاہِ قلندر
- دولتِ خداداد
- اقبال اور جناح
- یوم خاموشی

www.IqbalCyberLibrary.net
All rights reserved.
©2002-2006

راجا حسن اختر کی تنقید اقبالیات

راجا حسن اختر علامہ محمد اقبالؒ کے عقیدت مند تھے۔ انھوں نے علامہ اقبالؒ کے ساتھ کئی سال گزارے تھے۔ اقبالؒ کے سیکڑوں اشعار اُنھیں ازبر تھے۔ کلام اقبالؒ پر وہ گفت گو کرتے ہوئے ٹھکتے نہ تھے۔ ان کی خوش بختی یہ بھی ہے کہ انھوں نے خود حضرت علامہ اقبالؒ سے بھی کلام اقبال سمجھا تھا۔ اس لیے راجا حسن اختر نے کلام اقبال پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ راجا حسن اختر کی تنقید کلام اقبال میں پوشیدہ و مستور معنی و مفہوم کے دریچے وا کرتی ہے جس سے افکارِ اقبال کے نئے نئے گوشے ملتے ہیں۔ اس لیے یہاں اُن کی کلام اقبال پر تنقید کے حوالے سے چند تحریریں شامل کی جاتی ہیں۔

راجا حسن اختر کے تنقیدی مضامین سے پہلے اُن پر تھوڑا تبصرہ کرتے ہیں پھر اُن کے مضامین کو شامل کیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی تنقید اقبالیات سے براہ راست استفادہ کیا جا سکے۔

راجا کا خیال ہے کہ اقبال کی شاعری اسلام کے ضمیر پاک سے پیدا ہوئی ہے۔ اقبال کے خیال میں شاعر قوم کے دل اور نگاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ نظریہ اقبال پر صادق آتا ہے گویا اقبال عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کا دل اور نگاہ ہے۔ اقبال کے علم و بصیرت اور فکر و تدبیر سے بہت زیادہ لوگ متاثر ہیں۔ متاثرین اقبال کا خیال ہے کہ وہ اگر اپنے نظریات و افکار اپنے اشعار کی بجائے نثر میں لے آتے تو زیادہ نتیجہ خیز ہوتے۔ راجا صاحب کا اپنا خیال ہے کہ نثر کی نسبت شعر زیادہ پر اثر ہے اور اس کا نفع یا نقصان جلد ظاہر ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دین و اخلاق پر شیطانی حملے ہو رہے تھے لیکن اقبال نے شیطان کو مسلمان بنا کر ہماری قومی تعمیر کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ انھوں نے حسنِ محبوب اور ساغر میں عکس رخ یار دیکھنے والی خواہشات کو باطل قرار دے کر مسترد کر دیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ ملت اسلامیہ زہر

ہلاہل پی رہی تھی اور گھر پھونک کر محو تماشا تھی اقبال نے ملت اسلامیہ کو نیا شعور عطا کیا۔اقبال کی شاعری کو انھوں نے ربانی شاعری اور آسانی حکمت کہا ہے۔انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں علامہ کے حکیمانہ اشعار کا خوب انتخاب کیا ہے۔

شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے

علماء اور صوفیاء نے اپنے آپ کو محدود کیا اور تنگ نظری کا شکار ہوئے اور درختوں کے خشک پتے کی طرح ویران ہو گئے۔

شاعر بھی ہیں پیدا علماء بھی حکماء بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مضمون شاعر ربانی راجا صاحب کے تنقیدی شعور کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس کی تنقید اقبالیات میں اہم مقام پر رکھا جا سکتا ہے۔اقبال کی نگاہ ایک نقطہ نور تک پہنچی اور وہ اس نقطہ نور کو خودی کے نام سے پکارتا ہے اور کبھی کبھی روح، دل، ضمیر، جان پاک وغیرہ ناموں سے یاد کرتا ہے۔

راجا صاحب نے خودی کی بہت خوب صورت تعریف کی ہے وہ کہتے ہیں۔

انسانی بدن بھی خودی کے احوال میں سے ایک حالت کا نام ہے۔خودی درست ہے تو بدن بھی درست رہتا ہے خودی مقصود ہے بدن مقصود نہیں۔قوموں کا جتماعی نظام بھی ان کی خودی سے پیدا ہوتا ہے۔اقبال کے نزدیک دین محض چند رسوم کا نام نہیں بل کہ ان رسوم سے اس حرارت کو زندہ رکھتا ہے جو ایک مرد مسلمان کو اپنے قومی نظام اور الہٰی شریعت کے ساتھ پیوستہ رکھتی ہے۔

در بدن داری اگر سوز حیات
ہست معراج مسلمان در صلوات

اقبال کے نزدیک دین اور اس کی تمام تجلیات کا سرچشمہ حضور ﷺ سرور

کائنات کا ضمیر ہے۔اقبال نے کسب حلال کو عظمت انسانی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ راجا نے اقبال کے اس تصور کو اجاگر کیا ہے کہ حریت، عدل اور مساوات کی بنیادوں پر ہمارا شرعی نظام ہمیں ہم دل سے یک نگاہ بنا دیتا ہے۔شاعر ربانی راجا صاحب کا ایک اعلیٰ تنقیدی مضمون ہے۔(م۔ص ۱۱۸۔۱۱۰)۔

مسلک وفا راجا حسن کا ایک اور خوب صورت مضمون ہے وہ لکھتے ہیں کہ جن اقوام میں سے وفا اٹھ جاتی ہے وہ تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ایسے ماحول میں دین، علم، ادب اور شعر ناکام ہو جاتے ہیں۔اقبال نے دنیا میں آنکھ کھولی تو ان کے گرد ایسا ہی ماحول تھا لیکن انھوں نے آغوش وفا میں آنکھ کھولی۔اقبال نے اپنے کلام میں بار بار فرنگی افکار کو آگ سے تشبیہ دی اور اس کی خاصیت نامہ بتائی ہے کہ یہ قوموں کی انفرادیت فنا کر کے انھیں فکری لحاظ سے گداگر اور سیاسی لحاظ سے غلام بنا لیتے ہیں اور گداگروں اور غلاموں کے اس ٹولے کا محبوب ترین مشغلہ قوم سے غداری اور بے وفائی ہوتا ہے۔اقبال نے اس لیے فرنگی تہذیب کو ابلیسیت کا متشکل نشان قرار دیا اور افرنگ کے اس جرم کو ''یہود و استریوتی'' کے جرم بے وفائی سے زیادہ مذموم قرار دیا۔فرنگی تہذیب کا جو نقشہ علامہ اقبال نے پیش کیا اس میں سے راجہ صاحب کا انتخاب بہت عمدہ ہے۔(م۔ص ۱۲۲)انھوں نے تہذیب فرنگی کا نقشہ کلام اقبال کے خطوط سے واضح کیا ہے اور فرنگیوں کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ اقبال اہل مغرب میں رہ کر مغربی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود مغربی تہذیب کی ظاہری چمک پر فریفتہ نہیں ہوئے کیوں کہ اس میں فریب، دھوکا اور مکاری ہے۔ ظاہر میں اس کی چمک دکھائی دیتی ہے مگر اس کے اندر اندھیرے ہیں۔وہ مغربی طرز فکر کو اقبال کی زبانی اس طرح بے نقاب کرتے ہیں۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں زرا
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

بے وفائی اقبال کے مسلک میں گناہ عظیم اور ملت سے غداری ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ انھیں فرنگی تہذیب وافکار کی جہاں سوز آگ میں ڈالا گیا۔ مگر وہ صحیح وسلامت اس سے نکل آئے۔ اقبال تو مسلک وفا کی راہ پر گام زن ہونا چاہتے ہیں۔ انھیں ملت کا وفادار فرزند ہونے پر ناز ہے۔ قوم کی مظلومی اور غریبی کا درد ان کے سینے میں ہے یہی وفا ان کو مصور پاکستان بنا دیتی ہے اور وہ انگریز کی غلامی سے آواز مملکت کا تصور پیش کر دیتے ہیں تا کہ ملت اسلامیہ اس وطن میں اپنی تہذیب اور تمدن کے ساتھ دینی آزادی کی شاندار زندگی گزار سکے۔

مضمون ''مرد حق'' میں راجا حسن اختر نے اقبال کے مرد مومن اور مرد حق کا تصور واضح کیا ہے۔ راجا صاحب کے بہت خوب صورت جملے دکھائی دیتے ہیں۔ ظہور انسان کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ عشق اس لیے مست ہے کہ اسے اپنے جوہر کی آزمائش کا ایک وسیلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ حسن اس لیے ہمہ تن مسرت ہے کہ اس کی دل ربائیوں اور رعنائیوں کا نظارہ کرنے والا آ گیا ہے۔ فطرت مجبور و حیران ہے کہ اس عالم مجبور میں سے ایک ایسی ہستی پیدا ہو رہی ہے جو اس کی طرح مجبور نہیں بل کہ خودگر، خودشکن اور خودنگر ہے۔ عالم اسرار میں دھوم مچی ہوئی ہے کہ اب اسرار کی پردہ کشائی ہونے والی ہے۔

نعرہ زر عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کی صاحب نظرے پیدا شد

مکان کی تسخیر یعنی کائنات کا شکار انسان کی اولین منزل ہے کائنات کی تسخیر ہی اس کی چشم بصیرت وا کرتی ہے۔ یہ ملک خدا جس میں زمین و آسمان شامل ہیں یہ سب انسان کو ورثہ میں ملے ہیں۔۔۔ آدم کی طلب اس عالم تک محدود نہیں وہ اس کا

آزر نہیں بل کہ ابراہیم ہے۔ اقبال کو انسانی ممکنات کا پورا پورا علم تھا اس کی تقدیر سے مکمل آگاہی تھی۔ جس قوم میں مرد خدا پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہو وہ قوم انسانوں کی خدمت اور امامت کی صحیح حق دار نہیں بن سکتی۔

آہ زاں قومے کہ از پا بر فتاد

میر و سلطاں زاد و درویشے نزاد

اقبال جس زمانے اور جس ماحول میں پیدا ہوئے اس میں تہذیب و تمدن کی جلوہ آرائیوں کے درمیان شرف انسانی کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔۔۔ ابنائے آدم بھیڑیوں اور بروں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ اقبال کا دل پکار اٹھا۔

زیر گردوں آدم آدم را خورد

ملتے بر ملتے دیگر چرد!

ان حالات اور حوادث کو اقبال کے حساس دل نے محسوس کیا۔ راجا کہتے ہیں کہ اقبال کا پیرایہ بیان ایک دردمند انسان کا ہے۔ جو شرف انسانیت کی اس بے حرمتی و بے توقیری پر کبھی حضور باری، شکووں اور شکائتوں میں مصروف ہے تو کبھی دعاؤں اور مناجاتوں میں۔ اور دوسرا پیرایہ بیان ایک نہایت درجہ متوازن ہم وار فکر انسان کا ہے۔۔۔ ذرا شکووں کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا

کہوں کیا ماجرا بے بصر کا

نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں

یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا!

تنقید اقبال میں راجا حسن اختر کا یہ مضمون ایک اعلیٰ پائے کا مضمون ہے جس کا مختصر ذکر یہاں کیا گیا۔

بارگاہ قلندر بارگاہ اقبال تھی جہاں سے راجا خوب فیض یاب ہوئے۔ مضمون

''بارگاہ قلندر'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا صاحب بارگاہ قلندر تک کس طرح رسائی حاصل کر سکے۔اور بارگاہ حضرت اقبال ان کے لیے کون سے مدرسہ کی حیثیت رکھتی تھی۔راجا لکھتے ہیں:۔

ایک دوست کے مکان پر گیا تو اس نے کلام اقبال میں سے نظم شکوہ کے یہ اشعار ایک کتابچہ میں سے سنائے۔

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

وہ کہتے ہیں اسلام کے عظیم الشان عہد ماضی کے متعلق یہ پہلی اذان تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے کتابچہ اٹھایا اس کی پشت پر حضرت کی مطبوعہ نظموں کی فہرست دیکھی۔ یہ نظمیں ''مرغوب ایجنسی لاہور'' سے ملتی تھیں۔ میں نے نظمیں وہاں سے منگوالیں اور یاد کر لیں۔۔۔تقریباً دو سال بعد حضرت علامہ کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوا۔۱۹۲۶ء میں دوسری بار حاضر ہوا اور پھر جہاں بھی ہوتا سال میں پانچ چھ مرتبہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔۱۹۳۴ء کی ابتدا میں لاہور آیا اور حضرت کی وفات تک یہاں ہی رہا۔اس زمانے میں مجھے قدم بوسی کا زیادہ موقع ملتا رہا۔اپنے ملازمین کے ساتھ حضرت کا سلوک نہایت بزرگانہ اور مساویانہ تھا۔بچوں کو دیکھ کر آپ بہت خوش ہوتے تھے۔ایک بار میں نے بیٹے کی منہ پر ہلکا سا چانٹا مارا تو فرمانے لگے ''رسول اللہ ﷺ نے بچوں کے منہ پر چانٹا مارنے سے منع فرمایا ہے۔اس ارشاد میں اسلامی تربیت کے بنیادی اصول 'عزت نفس'' کی

طرف ایک لطیف ارشارہ موجود ہے۔

ذرا غور طلب بات ہے کہ کلام اقبال کا مرکز انسان اور مومن ہے اور اس کی صفات میں سے ایک اعلیٰ صفت عزت نفس ہے۔ اقبال نے انسان کو عزت نفس کو خوب خوب درس دیا ہے۔ راجا حسن کی فراہم کردہ معلومات جن کا تعلق علامہ کی نجی زندگی سے ہے بہت اہم ہیں۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اسلامی طرز فکر، طرز عمل اور انداز تربیت کا درس دیتے تھے۔ بل کہ ان اصولوں کا ان کی اپنی زندگی میں گہرا دخل تھا۔ پھر راجا صاحب نے بتایا:۔

اس کے دستر خوان پر کھانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ لباس بھی نہایت سادہ ہوتا تھا۔ گھر پر ہوتے تو سردیوں میں قمیض پاجامہ اور کشمیری دھسہ اوڑھ لیتے اور گرمیوں میں زیادہ تر بنیان اور تہبند پر ہی گزارہ کر لیتے۔ شام کے وقت کوٹھی سے باہر صحن میں چارپائی پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں میں نے بجلی کا پنکھا کبھی وہاں استعمال ہوتے نہیں دیکھا۔

یہ جان کر بارگاہ قلندر کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے کہ ایک عاشق رسول ﷺ کس انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اس سے حضرت علامہ کی طبعی سادگی اور استغنا شان نمایاں ہوتی ہے۔ وہ کسی تضع یا نمائش کے قائل نہیں تھے۔ قناعت پسندی اور ان کا فطری رجحان تھا۔ جس عمل کی لوگوں کو تلقین کرتے تھے وہ انھوں نے خود اپنا رکھا تھا۔

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

راجا بتاتے ہیں حضرت علامہ کی طبیعت میں حد درجہ کی شگفتگی تھی۔ معمولی باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی شگفتہ پہلو نکال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ علی بخش سے دل لگی کے طور پر کہنے لگے ''عجب ہے اردو کے شعراء زلفوں کا ذکر کرتے ہیں مگر علی بخش کی مونچھوں کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔'' آپ کی باتوں سے سامعین تو خوب محظوظ ہوتے لیکن

آپ کی ہنسی زیر لب رہتی۔ جذب کی حالت میں ہوتے تو تھوڑے وقفے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں "یا اللہ" پکارتے راجا لکھتے ہیں:۔

علم کو حضرت علامہ جبرائیل سے مشابہ قرار دیتے ہیں مگر فرنگیوں کی صحبت بد میں یہ جبرئیل ابلیس بن جاتا ہے۔ فرنگیوں کے مزاج میں دوئی ہے اس لیے جان وتن اور ملک و دین میں دوئی اور تفریق انھیں نظر آتی ہے۔ شاعر ربانی نے تمام عمر دوئی کے تمام مظاہر کے خلاف بغاوت کی۔

اس طرح راجا صاحب نے اقبالؒ کے محکم نظریہ توحید کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو ان کے نظریات اور ایمان کی مظبوط بنیاد تھا۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ حضرت علامہ کو اپنی ملت بیمار کا بہت احساس تھا۔ آپ اس کے علاج اور بیماری کے لیے ہر وقت محو فکر رہتے تھے۔ انھوں نے حضرت کے اس خیال کو واضح کیا ہے کہ حضور ﷺ کی ذات کے اندر درویشی و سلطانی دونوں سمندر باہم ملتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ایک بار انھوں نے از راہ عقیدت عرض کیا "اللہ تعالی نے آپ کو مشرق و مغرب کے علوم کا جامع بنایا ہے" فرمانے لگے "ان علوم نے مجھے چنداں فائدہ نہیں پہنچایا مجھے نفع تو صرف اس بات سے پہنچا ہے کہ جو میرے والد نے بتائی تھی"۔ میں نے عرض کیا میں وہ بات معلوم کرنے کی جسارت کرسکتا ہوں فرمایا "رسول اللہ ﷺ کے نام پر صلوٰۃ و درود"

اس سے علامہ اقبالؒ کی اس بنیادی تربیت کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں اپنے گھر میں دی گئی۔ اس تربیت کی بنیاد عشق رسول ﷺ اور صوفیانہ طرز عمل ہے۔ راجا صاحب نے بتایا کہ حضور اکرم ﷺ کا نام لب پر آتے ہی علامہ رقت میں آجاتے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ وہ کہتے ہیں ایک بار میں نے جاوید نامہ کی اشاعت کے وقت دانستہ طور پر پوچھا "ادبی معراج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی" راجا صاحب کہتے ہیں "مجھے کیا معلوم تھا کہ کسی نہایت ہی

نازک تار پر چوٹ پڑے گی۔ ایک عجیب سی کیفیت عجز طاری ہو گئی۔ فرمایا ''وہاں پہنچنا کب آسان ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

می توانی منکر یزداں شدن

منکر از شان نبی نتواں شدن

اس پر سخت رقت طاری ہوئی اور بہت سے اشعار پڑھ ڈالے۔

راجا صاحب نے اقبال کے قرآن سے لگاؤ اور عقیدت کا منظر بھی پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں:۔

آپ کے روبہ رو قرآن حکیم پڑھا جاتا تو بدن پر لرزہ طاری ہو جاتا، چہرہ تمتما اٹھتا اور آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جاتا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر میں نے جب پہلی مرتبہ یہ نظارہ دیکھا تو مجھ پر سکتا طاری ہو گیا۔ ایک مرتبہ علم کیف میں آپ بار بار قرآن مجید کے متعلق یہ مصرع دہرا رہے تھے۔

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک تھی۔ رقت اور سوز کی حالت میں جو کیفیت ہو جاتی وہ ناقابل بیان ہے۔

یہ ایک عاشق رسول ﷺ عاشق قرآن اور صوفی مرد حق کی تصویر ہے جو راجا حسن اختر نے پیش کی ہے۔ یہی تصوف عشق رسول ﷺ اور عشق قرآن اقبال کے سینے میں موج زن ہے اور اقبال نظام عدل و مساوات کا متمنی ہے۔ اقبال کا ذوق و شوق، خود آ گہی اور جہاں بینی کے لیے مخصوص تھا۔ اس مضمون کے حوالے سے راجا صاحب نے اقبال کی شخصیت، کردار، سادگی، عشق رسول ﷺ عشق قرآن، تصوف، شوق جہاں بینی اور ذوق خود آ گہی کو واضح کیا ہے۔ یہ ان کا ایک اعلیٰ تنقیدی اور علمی مضمون ہے۔ راجا نے دولت خداداد کے زیر عنوان لکھا ہے:۔

اقبال عصر حاضر کے انسان، اس کے سیاسی اداروں اور حکومتوں سے غیر مطمئن

تھے۔ وہ ایسی ملک خداداد کے خواہاں تھے جہاں نظم عدل و مساوات ہو اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ ہو۔

یہ ایک وسیع و بلیغ مضمون ہے اس میں جن افکار اقبال کا تذکرہ دکھائی دیتا ہے وہ ان کے سارے کلام میں موجود ہے۔ فکر اقبال کے حوالے سے یہ بھی اہم معلوماتی اور تنقیدی مضامین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ ''اقبال اور جناح'' راجا حسن اختر کا ایک اور اہم مضمون ہے۔ یہ مضمون ان خطوط کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو حضرت علامہ اقبال نے قائداعظم کو لکھے۔ اس مضمون میں راجا حسن اختر نے اقبال کی سیاسی بصیرت کو نمایاں کیا۔ اقبال مستقبل کو دیکھ رہے تھے اور قائداعظم کی صورت میں انھیں ایک عظیم راہ نما دکھائی دے رہا تھا۔ وہ قائداعظم کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کا مطالبہ کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ اقبال قائداعظم کو مسئلہ فلسطین کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ راجا کہتے ہیں ایک بار میں نے پوچھا ''مسٹر جناح کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟'' کہنے لگے ''صاحب خودی تو ہے'' اس پر حضرت نے بہ رقت اپنے اشعار پڑھے۔ راجا حسن اختر لکھتے ہیں کہ ایک بار قائداعظم کا یہ فقرہ پڑھا گیا'' میں آزاد ہندوستان کے اندر آزاد اسلام کا داعی ہوں''۔ قائداعظم کو اپنا راہ نما سمجھتے تھے۔ ایک بار پنڈت نہرو اور پنجاب کے مسلمان لیڈر حضرت علامہ اقبال سے ملنے آئے۔ پنڈت کے ایک ہم راہی مسلمان نے خوشامدانہ لہجے میں حضرت سے کہا کہ اگر وہ توجہ فرمائیں تو مسلمانوں کا کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ ہوسکتا ہے۔ اس پر حضرت کی طبیعت مکدر ہوئی اور فرمایا کہ جناح کی غیر حاضری میں ایسی باتیں نہیں کرسکتے اور وہ اپنے آپ کو جناح کا ایک سپاہی تصور کرتے ہیں۔ یہ اس تاریخی ماحول کا ایک خوب صورت تذکرہ ہے جس میں ان دو عظیم شخصیتوں نے ذہنی و روحانی عروج حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے لیے ان دونوں شخصیات کی راہ نمائی اور قوت ارادی مسلمانان ہند کے کام آئی۔ اس کے علاوہ

راجا کے مضامین یوم خاموشی، مسئلہ فلسطین، حضرت امام ربانی، پٹھانوں کی غیرت ملی اور کشمیر، برطانیہ اور ہندوستان بھی اہم مضامین ہیں۔ مسئلہ کشمیر کے متعلق راجا صاحب نے لکھا ''مسئلہ کشمیر ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ لیکن دہلی کی ایک خبر کے مطابق ہندوستان کے لیے اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی قومیت کے لوگوں کے شہری مسائل کی۔ انھوں نے اس حوالے سے انگریزوں کے شاطرانہ طرزِ عمل اور ہندو راہ نماؤں کے مکارانہ طرزِ فکر کا تذکرہ بھی کیا۔

ان تحریروں اور حوالہ جات کے خدوخال یک جا کرنے سے راجا حسن اختر کی کچھ اس طرح کی تصویر سامنے آتی ہے۔ راجا حسن اختر ایک خوش لباس، خوش خوراک، خوش شکل اور خوش اخلاق انسان تھے۔ درسِ اقبال نے ان کے قلب کو عشق رسول ﷺ سے مالامال کر دیا تھا وہ حضور ﷺ کا نام نامی لب پر آتے ہی احترام سے سر جھکا دیتے اور ہر عاشق رسولؐ پر جان فدا کرنے کو تیار ہو جاتے۔ مکتب رسول ﷺ کے طالب علم حضرت اقبال نے انھیں قومی اور ملی درد سے آشنا کیا۔ وہ بھی ذات پات اور علاقائی حد بندیوں سے نکل کر انسانیت کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ وہ لوگوں کے دلوں پر حکمران ہو گئے اور دولت مقبولیت سے سرفراز ہوئے۔ اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا تو بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کرتے ہوئے قومی اسمبلی کے ممبر بن گئے۔ اقبال سے درس سیاست بھی لیا۔ اقبال کی مسلم لیگ سے وابستہ ہونے اور دل و جان سے اس کے لیے قائداعظم کے ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے لگے حتیٰ کہ مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور پاکستان مسلم لیگ کے نائب صدر بنا دیے گئے۔ تحریک پاکستان کے حوالے سے خدمات انجام دینے پر حکومت پنجاب نے بعد از وفات انھیں گولڈ میڈل دیا۔ انھوں نے سہروردی کی جانب سے عہدہ ملنے کی امید کے باوجود ان کی پارٹی میں شمولیت سے

انکار کر دیا کہ ان کی پارٹی کے نام الفاظ مسلم لیگ اور قائد اعظم شامل نہیں۔ وہ حضرت اقبال، حضرت قائد اعظم، پاکستان مسلم لیگ کے نام پر جان نثار کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ وہ سچے پاکستانی محب وطن اور خادم قوم تھے۔

راجا حسن اختر مضبوط ادبی ذوق رکھتے تھے۔ راجا صاحب کی تحریریں پر مغز اور جان دار ہیں۔ ان کی نثری تحریریں عمدہ فن پارے ہیں۔ ان تحریروں میں ان کا ذوق نظر اور ذوق خبر دکھائی دیتا ہے۔ وہ دلائل و براہین سے اپنی بات کو ثابت کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ شاعری کا بھی شوق رہا۔ اس مقالہ میں بھی ان کے اشعار شامل ہیں۔ لیکن ان کے مرشد اقبال نے شاعری سے منع فرمایا تو پھر کبھی شعر نہ کہا۔ وہ اپنے مرشد کی ہر آواز پر ہمہ تن گوش رہتے اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کو عبادت سمجھتے تھے۔

تنقید اقبالیات میں راجا صاحب کی تحریریں اہم اضافہ ہیں۔ انھوں نے حضرت اقبال پر نئے زاویوں سے رائے کا اظہار کیا ہے بعض ایسی باتیں جو دوسرے حضرت اقبال کے متعلق کر چکے ایسی باتیں بھی انھوں نے اس انداز سے کی ہیں کہ وہ نئی معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے حضرت علامہ اقبال کی نجی زندگی کے متعلق ایسی باتیں بھی بتائی ہیں جو کسی اور وسیلے سے اقبال کے قارئین تک نہیں پہنچیں۔ اس طرح راجا صاحب کی تحریریں اقبالیاتی سوانحی ذخیرے میں ایک اضافہ کرتی ہیں۔

راجا صاحب کے مضامین تنقید اقبالیات میں ایک اہم اضافہ کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت اقبال کے تصوف خودی، عشق رسول، سیاسی زندگی، معاشرتی زندگی، مجلسی زندگی، تصور ملت، تصور مومن، طبعی شگفتگی، گھریلو زندگی، سادگی، عجز و انکساری اور کئی دوسرے موضوعات پر بڑے خوب صورت انداز سے رائے زنی کی ہے۔ ان کا انداز تحریر دل کش، پر اثر اور وقیع ہے۔ ان کی تحریریں نہ صرف ایک شاندار ادبی ذخیرہ ہیں بل کہ تنقید اقبالیات میں ایک عمدہ اور قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں یہ ایک نو دریافت ذخیرہ ہے جس کی روشنی

میں تنقید اقبال پر کام کرنے کی مزید گنجائش موجود ہے۔ راجا صاحب اقبالیاتی ادب میں نقاد اور تجزیہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

راجا حسن اختر کو اقبال شناسوں میں ایک منفرد مقام حاصل ہے لیکن افسوس کی ان پر تحقیقی کام نہیں کیا گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ درویش اور بے لوث اقبالی تھے۔ وہ اپنے مرشد کی طرح نمائش اور تصنع کے قائل نہیں تھے۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی گہما گہمی سے نکل کر وہ اپنے علاقے میں کہوٹہ چلے آئے تھے جو ایک قصبہ ہے لہٰذا لاہور کے علمی، ادبی اور اقبالی حلقوں نے انھیں بھلا دیا۔ اور وفات کے بعد تو وہ سب کی نظروں سے بھی اوجھل ہو گئے تھے۔ ان کی تحریروں سے اقبال کے ذہنی اور ارتقا اور تصوف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے حضرت اقبال کی نجی زندگی کے بعض پہلوؤں سے پردے اٹھائے ہیں۔ وہ حضرت اقبال کے کس طرح قریب ہوئے اور کتنے قریب ہوئے اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ وہ مکتب اقبال سے فیض یاب ہوئے اور ان کی دنیا بدل گئی۔ اقبال کی محفلیں ان کے لیے باعث تسکین قلب ہو گئیں۔ حضرت علامہ کی محفلوں میں بیٹھنے والے اور بھی اقبال شناس ہوتے تھے لیکن راجا حسن اختر تو کلام اقبال اور پیغام اقبال کے مبلغ اور پیام بر بن گئے۔ کوئی بھی محفل ہو اس میں راجا کلام اقبال کا حوالہ ضرور دیا کرتے تھے۔ اپنے بچوں کو کلام اقبال پڑھنے اور یاد کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ چٹان اور دوسرے جرائد میں حوالے ملتے ہیں کہ شائد ہی پاکستان میں کوئی دوسرا شخص ہو جو کلام اقبال کے ضمیر کو ان سے بہتر سمجھتا ہو۔ انھوں نے کلام اقبال کے ضمیر کو نہ صرف سمجھا بلکہ اپنے اوپر لاگو کیا اور سچے عاشق ہو گئے۔ چوں کہ کلام اقبال کا ضمیر بھی عشق رسول ﷺ ہے لہٰذا وہ عاشق رسول ﷺ ہو گئے۔

اقبالیاتی ادب تنقید اقبال اور اقبالیاتی سوانحی ذخیرے میں ان کی تحریریں بہت کارآمد قابل قدر ہیں۔ اقبالیات کے لیے نہ صرف ان کی تحریریں قابل قدر ہیں بل

کہ بہت سی حیثیتوں سے انھوں نے اقبالیات کی تشہیر وتوضیح کے لیے کام کیا۔ وہ یوم اقبال پر ملک کے مشہور شہروں اور تعلیمی اداروں میں جاتے اور وہاں پر مغز مقالات پڑھتے اور پر مغز گفت گو کرتے۔ ان کی بہت سے مقالات ضائع ہو گئے۔ ان کے کچھ مقالات سے ان کے مرحوم بیٹے محمود کیانی نے بھاپنے کی سعی کی لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس کام کو مکمل نہ کر سکے۔ اور وہ مقالات ضائع ہو گئے ان کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جو مقالات مل سکے وہ مقالہ میں شامل ہیں اور قارئین ان کی ادبی تنقیدی اور سوانحی حیثیت کا تعین کر سکتے ہیں۔

راجا صاحب نے حمید نظامی کے ساتھ مل کر مجلس اقبال کی بنیاد ڈالی اور اقبالیات میں اضافے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ وہ مجلس اقبال کے صدر بھی رہے۔ مزار اقبال کی تعمیر کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی اس کے سیکریٹری اور صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مزار کی تعمیر میں مجلس اقبال کے ارکان اور دیگر عقیدت مندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ راجا حسن اختر نے دامے درہمے سخنے اس میں حصہ لیا۔ مزار میں حضرت اقبال کے اشعار لکھوانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی راجا حسن اختر اس کے رکن تھے۔ راجا حسن اختر کی زندگی میں حضرت اقبال کے حوالے سے کوئی بھی مجلس و کمیٹی یا تنظیم قائم ہوئی تو راجا اس میں نمایاں حیثیت سے شامل ہوئے۔ اس طرح اقبالیات کے لیے راجا صاحب کی بہت بڑی عطا (Contribution) ہے۔

شاعرِ ربانی

اقبال کی شاعری اسلام کے ضمیر پاک سے پیدا ہوئی۔ اس کے نظریہ کے مطابق شاعر قوم کے دل اور نگاہ سے مشابہ ہے۔ یہ نظریہ اس کی اپنی شاعری پر پورے طور پر صادق آتا ہے۔ اقبال کی ربانی حکمت کے بہ غور مطالعہ سے انسان آسانی سے اس یقینی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کا دل اور

نگاہ ہے۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ کم ہیں جو اقبال کے علم و بصیرت اور فکر و تدبر کے قائل نہ ہوں۔ ایک گروہ ایسا ضرور ہے جس کا ازراہِ اخلاص یہ خیال ہے کہ عجمی اور ہندی شاعری کی روایات بالکل فاسد اور مہلک ہیں۔ اس لیے اقبال اپنا پیغام اگر نظم کی بجائے نثر میں دیتے تو زیادہ موثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتا اقبال کا شاعری کو ذریعہ پیغام بنانا اس کی فطرت کا ایک سربستہ راز ہے لیکن اس کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ شعر اپنی کیفیت کے اعتبار سے بہت ہی سریع الاثر ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ سامع کو اطلاع ہو، یہ کانوں کے ذریعے اس کے دل می اتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نفع یا ضرر بہت زیادہ ہے۔ ایک دفعہ حضورﷺ سرورِ کائنات نے فرمایا کہ ہر آدمی کا شیطان خون کی طرح اس کے رگ و ریشے میں جاری ہے۔ ایک صحابی نے عرض کیا کہ جناب ﷺ کے شیطان کی کیا صورت ہے؟ جواب میں فرمایا کہ ''میرا شیطان میرے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا''۔

اقبال نے بھی اس شیطان کو جس نے ہمارے دین و اخلاق کو بازیچۂ اطفال بنایا ہوا تھا۔ مسلمان بنا کر ہماری قوم تعمیر کی خدمت میں لگا دیا۔ لچر اور پوچ عجمی خیالات، جن کے بے اصول اور بے بنیاد ہونے میں کسی کو بھی شبہ نہیں۔ شعر کا حسین اور نظر فریب جامہ اوڑھ کر ابدی طور پر ہمارے دل اور دماغ میں سرایت کر گئے ہیں۔ اس نے جب چاہا جنوں کو خرد اور خرد کو جنوں کہہ دیا۔ اس کے نزدیک دانۂ انگور کا ٹوٹ کر شراب بننا ایسا ہے گویا ستارے ڈھل رہے ہیں اور آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ یہ جب چاہے معشوق کے بدلے سمرقند اور بخارا بخشنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے فرضی محبوب کے خد و خال کے اسلحہ خانے میں اس قدر تیر، تلواریں اور کمندیں موجود ہیں جو اپنوں بیگانوں سب کو ہلاک کر دیں۔ یہ زندگی کی سطحی لذتوں کو نقد اور اخروی کامرانیوں کو ادھار کہہ دیتا ہے۔ اس کے سایہ کے اندر گناہ اپنے آپ کو ثواب اور ثواب اپنے آپ کو گناہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس عجمی کانِ نمک کے اندر جو اہلِ

ہنر داخل ہوئے خود نمک ہو کر رہ گئے۔

ان حضرات کے تخیل کی رنگیں اور دل فریب غلام گردشوں میں آپ تشریف لے جائیں اور دیکھیں کہ پرانے عجمی اسلوبِ فکر کے ساغر کے اندر کس حد تک آپ کو عکسِ رخِ یار نظر آتا ہے۔ قومیں جب فتوحات سے تھک جائیں تو ممکن ہے کہ اس قسم کا حب افیون ان کے لیے جائز تصادم نہ پیدا کرے۔ لیکن مرض اور غلامی کے زمانے میں اس کے جواز کی مثال ایسی ہے گویا ایک جاں بلب مریض کو اس کے آخری سانس اور ایک خانہ برباد مزدور کو اس کے آخری سہارا سے محروم کر دیا جائے۔ اب تک یہ سب کچھ کھلے بندوں ہو رہا تھا۔ ہم زہر ہلاہل پی رہے تھے۔ ہم گھر پھونک تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی کی اس سحر مبین کے سامنے جواب گفتار اور مجال تعرض نہیں تھی۔ ہمارے افق پر اس قسم کی سیاہ اور خوف ناک بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اقبال کی ربانی شاعری اور آسمانی حکمت اس پرانے سومنات فکر کی تعمیر کا عزم لے کر اٹھی۔ اس نے اپنی حکیمانہ شاعری کی اصل عظیم کا پتا نہایت واضح طور پر دے دیا ہے۔

ہم نوا از جلوۂ اغیار گفت
داستانِ گیسو و رخسار گفت
من شہید تیغ ابروئے تو ام
خاکم و آسودۂ کوئے تو ام

بکوئے دلبراں کارے ندارم
دلِ زارے غم یارے ندارم
بجبریل امیں ہم داستانم

رقیب و قاصد و درباں ندانم؎

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر وزیر
میرا نشیمن بھی تُو شاخِ نشیمن بھی تُو؎

تجھ سے گریباں مرا مطلعِ صبحِ نشور
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو

تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ
تُو ہی مری آرزو، تُو ہی مری جستجو؎

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ہو میرے رگ و پَے میں ہے؎

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لُغت ہائے حجازی کا؎

ہماری قومی زندگی کی تین بڑی شاخیں یعنی علم،فقر اور سیاست حیات ملی کے شجر طیبہ سے کٹ کر بہار کی موہوم امید رکھ رہی ہیں۔ علماء، صوفیاء اور اہل سیاست دینی شاہ راہ سے ہٹ کر اور اپنے اپنے تنگ دائروں میں محصور ہو کر اشک بار اور تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب اپنے شجر سے پیوستہ تھے تو اپنی بلندی اور وسعت میں زمین و آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ جب کٹ گئے تو خشک اور بے نم ہو کر زرد

پتوں اور خشک ریشوں کا ایک طومار نظر آنے لگے۔

شاعر بھی ہیں پیدا، علما بھی، حکما بھی
خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ

مقصد ہے ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک
ہر ایک ہے گو شرحِ معانی میں یگانہ

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضا مند
تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

اس بدحالی اور پریشان صورتی کی بنیادی علت اقبال کی عقابی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔

کتابیات

۱۔ اقبال: ضرب کلیم، لاہور، علی عمران پرنٹرز س۔ن

۲۔ اقبال، بال جبریل، لاہور، علی عمران پرنٹرز، س۔ن

۳۔ اقبال، کلیات اقبال، اردو، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۴ء

۴۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۵ء

۵۔ انور سدید ڈاکٹر، اقبال شناسی اور ادبی دنیا، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۸ء

۶۔ ایم ایس ناز، حیات اقبال، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، س۔ن

۷۔ جاوید اقبال، زندہ رود، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۸ء

۸۔ چودھری حبیب احمد، تحریک پاکستان اور نیشلسٹ علماء، لاہور، مکتبہ البیان، ۱۹۶۶ء

۹۔ حسن اختر کیانی، ایک سپاہی ایک شاعر، راول پنڈی، ایس ٹی پرنٹرز، ۱۹۹۴ء

۱۰۔ رائے زادہ دنی چند: راجا محمد یعقوب طاری (مترجم)، کیگوہر نامہ، جہلم، انجمن رفاہِ گکھڑاں، ۱۹۸۶ء

۱۱۔ رحیم بخش شاہین، اوراق گم گشتہ، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، ۱۹۷۹ء

۱۲۔ سعید راشد، مکالماتِ اقبال، جہلم، بک کارنر پبلشرز، ۱۹۸۸ء

۱۳۔ سلطان ظہور اختر، حسن آفاقی، راول پنڈی، مکتبہ حسن اختر، ۱۹۸۵ء

۱۴۔ عبدالمجید سالک، ذکر اقبال، لاہور، بزم اقبال، ۱۹۸۳ء

۱۵۔ عزیز ملک، پوٹھوہار، اسلام آباد، لوک ورثے کا قومی ادارہ، ۱۹۷۸ء

۱۶۔ غالب مرزا، دیوان غالب، کراچی، شوکت علی اینڈ سنز، س۔ن

۱۷۔ غلام اکبر ملک، گکھڑ اور کھوکھر، لاہور، العقاب پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

۱۸۔ قاسم محمود سید، مدیر، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، کراچی، شاہد بک

فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء

۱۹۔ محمد اعجاز بٹ، اقبال اور اقبالیات، لاہور، الاسد پبلی کیشنز، س۔ن

۲۰۔ محمد جہانگیر عالم مترجم و مرتب: اقبال کے خطوط جناح کے نام، جھنگ صدر، کاشف پبلشرز ۱۹۸۳ء

۲۱۔ محمد عبداللہ چغتائی ڈاکٹر، اقبال کی صحبت میں، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۲۲۔ محمد منور پروفیسر، میزان اقبال، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۲ء

۲۳۔ محمود اختر کیانی، میرا شہید بھائی، راول پنڈی، مکتبہ ابلاغ، ۱۹۷۱ء

۲۴۔ محمود نظامی، ملفوظات، نرائن دت سہگل، س۔ن

۲۵۔ وکیل انجم، سیاست کے فرعون، لاہور، فیروز سنز، س۔ن

۲۶۔ قرآن پارہ نمبر ۲۰ سورہ القصص آیت نمبر ۴

Research Society of Pakistan,

Extract from the District Gazetteers, Lahore,

University of the Punjab 1983.

جرائد

۱۔ انقلاب، جلد ۳ نمبر ۱۵ ایک شنبہ ۱۶/دسمبر ۱۹۲۸ء (سنڈے ایڈیشن)

۲۔ انقلاب، جلد ۱۲ نمبر ۲۳۶ چہار شنبہ ۵/جنوری ۱۹۳۸ء

۳۔ انقلاب، جلد ۱۳ نمبر ۳۹ جمعہ ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء

۴۔ چٹان، لاہور، ۱۹/اکتوبر ۱۹۶۴ء

۵۔ چٹان، لاہور، ۲۶/اکتوبر ۱۹۶۴ء

۶۔ چٹان، لاہور، ۱۱/مئی ۱۹۵۳ء

۷۔ روزنامہ تعمیر، راول پنڈی، ۱۵/اکتوبر ۱۹۶۵ء

۸۔ قندیل ہفت روزہ، اپریل ۱۹۴۸ء

۹۔ نوائے وقت، لاہور، ۱۶/اکتوبر ۱۹۶۴ء

۱۰۔ نوائے وقت، لاہور، ۱۷/اکتوبر ۱۹۶۴ء

۱۱۔ نوائے وقت، لاہور، ۱۸/اکتوبر ۱۹۶۴ء

۱۲۔ نوائے وقت، لاہور، ۲۲/اکتوبر ۱۹۶۴ء

اختتام ------------------------------ The End